جلد ۳۲	ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۳ء	عدد ۲،

مضامین

شذرات

گذشتہ شذرات میں بعض غلطیاں رہگئی ہیں جنکی اصلاح مناسب ہوگی، ورنہ آگے چل کر وہ شاید تاریخ کی غلطیاں بنجائیں، مولٰنا انورشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر وفات کے وقت یاد سے ستاون برس لکھدی گئی تھی، مگر انکے رفقاے خاص سے معلوم ہوا کہ انسٹھ برس تھی، اسی شذرہ کے آخر میں علم وحرفت چھپ گیا ہے، حالانکہ وہ علم ومعرفت ہے، امید ہے کہ ناظرین اسکو قلم سے درست کرلینگے،

منشی محبوب عالم مرحوم کے تذکرہ میں یہ لکھا گیا ہے کہ وہ اردو کے پہلے روزانہ اخبار کے بانی اور اڈیٹر تھے، اس سے مراد مسلمانوں میں تھی، یعنی اردو کے پہلے اسلامی روزانہ اخبار کے وہ بانی اور اڈیٹر تھے، اردو میں منشی نولکشور لکھنؤ کا اودھ اخبار اُن کے اخبار سے پہلے نکلا تھا، اور اب تک نکل رہا ہے،

اسدفعہ احباب کے اصرار پر جلسۂ سیرت کے موقع پر بڑودہ جانا پڑا، اعظمگڈھ سے ۲ر جولائی کی شام کو نکل کر لکھنؤ اور دہلی میں بارہ گھنٹے ٹھہر کر جولائی کی رات کو ۸ بجے بڑودہ کے دارالریاست میں پہنچا، اسٹیشن پر ریاست کے نمایندہ مسٹر کلکر اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے خیر مقدم کیا، ریاست کے مہمان خانہ میں ٹھہرنے کی جگہ ملی دوسرے دن ہز اکسلنسی دیوان بہادر کے زیر صدارت بڑودہ کالج کے ہال میں جلسہ منعقد ہوا، میں نے اور دوسرے مسلمان اور ہندو مرہٹہ مقرروں نے اپنے اپنے انداز میں سیرۃ نبوی کے موضوع پر تھوڑی تھوڑی تقریریں کیں، تیسرے دن جمعہ کے روز شہر کی جامع مسجد میں بعد نماز میری ایک اور تقریر ہوئی،

بڑودہ ہندوستان کی بڑی ترقی یافتہ ریاستوں میں ہے، آج سے ۲۲ برس پہلے جب میں نے حضرۃ الاستاذ مرحوم کے زیر سایہ انجمن اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تھا، تو یہاں آیا تھا، اس وقت وہاں کے مشہور مسلمان رئیس نواب صدرالدین خاں مرحوم جنکے [illegible] سے میرے عزیزانہ اور برادرانہ تعلقات تھے، اور ہنوز زندہ تھے، مرحوم نے اس وقت اردو کا سب سے بڑا کتبخانہ جمع کیا تھا، اور جامع مسجد کی تعمیر ختم ہورہی تھی، اب وہ ان کا اردو کتبخانہ اسی جامع مسجد میں انکے صاحبزادوں نے منتقل کردیا ہے، مگر افسوس کہ وہ مقفل پڑا رہتا ہے، اور کسی کو اس سے استفادہ کی توفیق نہیں ملتی،

ریاست بڑودہ کی آبادی چوبیس لاکھ ہے، جسمیں پانچواں حصہ مسلمانوں کا ہے، خود شہر کی ایک لاکھ کی آبادی میں بیس ہزار مسلمان ہیں، الغرض یہاں بیس فیصدی مسلمان آباد ہیں، تاہم آپکو یہ سنکر افسوس ہوگا کہ یہاں ایک بھی خاص مسلمانوں کا اسکول نہیں مجھے بتایا گیا کہ یہاں ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ ہے، جس سے اسوقت تک گیارہ سو لڑکے کامیاب ہوچکے ہیں، مگر ان میں مسلمان صرف آٹھ دس تھے جنمیں سے تین ریاست سے باہر کے تھے، یہی سبب ہے کہ بیس فیصدی اسلامی آبادی ہونے کے باوجود ریاست کی ملازمت اور مناصب وعہدوں میں مسلمانوں کا نام ونشان نہیں ہے، مسلمان اپنی غفلت کا الزام ریاست پر ڈالتے ہیں کہ وہ ہماری تعلیم کیطرف توجہ نہیں کرتی ہمکو بڑودہ کے بیدار مغز مہاراجہ کیساتھ جو حسن ظن ہے، اسکی بنا پر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ خود اُنکی ریاست کی بے توجہی سے وہاں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ بڑودہ کی ریاست کی تعمیر میں مسلمان امیروں اور سپاہیوں کی تلواروں کو بھی دخل ہے،

اگر لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جاسکتا ہے، تو بڑودہ کو کتبخانوں اور مدرسوں کا ملک کہا جاسکتا ہے، ریاست کے پورے طول وعرض میں متحرک کتبخانوں، مکتبوں اور مدرسوں کا جال پھیلا ہے، اور گجراتی کی ابتدائی تعلیم ہندو مسلمان سب کے لئے جبری ہے، شہر میں ایک عام کتبخانہ ہے، ایک خاص سنسکرت کا مشرقی کتبخانہ ہے، ایک متحرک کتبخانوں کا مرکزی کتبخانہ ہے، یہاں کے کتبخانوں کی عمارت، ترتیب اور تقسیم سب امریکی نظام پر ہے، اور حق یہ ہے کہ آج تک یہاں سے بہتر طریق پر کوئی کتبخانہ نظر نہیں آیا، سب سے بڑے کتبخانہ کی الماریاں منزل بہ منزل لوہے کی چھڑوں اور تختوں سے بنائی گئی ہیں، اور ہر منزل کی چھت دبیز شیشہ کی بنی ہے، تاکہ نیچے کی منزل میں بھی روشنی پہنچ سکے، اور کتبخانہ آتش زنی سے محفوظ رہے، اس وقت ریاست کے مرکزی کتبخانہ کے ماتحت پینتالیس بڑے اور آٹھ سو کے قریب چھوٹے کتبخانے ہیں، اور تقریباً ہر سال چار لاکھ کتابیں پڑھی جاتی ہیں،

بڑودہ سے بھڑوچ، اور وہاں سے راندیر، راندیر سے سورت، وہاں سے انکلشور، انکلشور سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے سورت ہوکر دہلی اور لکھنؤ کے راستہ سے ۱۶ر جولائی کو اعظم گڈھ واپسی ہوئی، ہر جگہ ایک دو تقریریں کرنی پڑیں، بھڑوچ دریاے نربدا کے کنارے وہ مقام ہے جہاں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں بحر عرب کی راہ سے نربدا میں داخل ہوکر مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ پہنچا تھا، اسکے ساحل پر پہنچکر تاریخ کا وہ مرقع آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور بے اختیار چند مصرعے موزوں ہوگئے،

راندیر گجرات کے دیندار تاجروں کا مرکزی وطن ہے، یہاں کی مسجدوں کی شان وشکوہ کو دیکھکر اُن سندبادِ بحری وبری تاجروں کے

قصے یاد آگئے جنکا الف لیلہ میں ذکر ہے، ۱۴ مسجدیں ہیں اور اکثر بڑی مسجدیں شروع سے آخر تک سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی موزوں ترکیب سے بنائی گئی

جامع مسجد، مسجد قوۃ الاسلام اور مسجد چار دواز بہترین مسجدیں ہیں، اور اپنی صفائی اور ستھرائی میں ہندوستان بھر میں بے نظیر معلوم ہوئیں، پانچ

آبادی ہے مگر اسکے اندر بہترین میونسپلٹی بہترین سڑکیں اور ہر جگہ سڑک پر برقی روشنی کا انتظام ہے، مسجدیں برقی پنکھوں سے راحت رساں اور برقی

منور ہیں، ان ظاہری سامانوں کیساتھ باطنی حیثیت سے بھی یہ مسجدیں نمازیوں سے آباد نظر آئیں، نوجوان مسلمانوں کی ایک خاص مجلس

ارکان باہمت ہیں، محفل اسلام نام ایک مجلس ہے جسنے اردو عربی، انگریزی اور گجراتی کا اچھا خاصہ کتبخانہ جمع کیا ہے، ایک گوشہ میں ایک پرانا

جو حسب دستور ایک گنبد کے نیچے چادروں اور غلافوں میں لپٹا ہوا، مزوروں کے جھرمٹ میں ہے اور جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ کسی تابعی یا تبع

بھروچ اور سورت اور راندیر میں ایسی مسجدیں نظر آئیں جنکی تاریخیں پانچویں صدی کی بتائی جاتی ہیں، اور کہیں دروازوں پر لکھی بھی دیکھی

میں ایک عربی مدرسہ محمدیہ بھی موجود ہے، جس میں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اسمیں قدیم عربی کیساتھ جدید عربی بھی سکھائی جاتی ہے،

ڈابھیل سورت سے ایک دو اسٹیشن بعد ایک گاؤں ہے جہاں کے دو تاجر مگر اس ستارہ کو جو دیوبند کے نظام شمسی سے چند سال پہلے ٹوٹ

اٹھا لائے ہیں، ہر قسم کی عمارتیں، مسجد، کتبخانہ، مہمان خانہ، دار الحدیث اور دار الطلبہ غرض چند مخیر تاجروں کی فیاضی سے بے منت غیر

کے عرصہ میں بنکر تیار ہو گئی ہے، صرف مدرسہ کی خاطر بجلی کی روشنی کا خاص اہتمام ہے، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا

صاحب اور دوسرے فاضل علما درس میں مصروف ہیں، اور تین سو کے قریب طالب العلم ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے زیر تعلیم

اور اردو کے کتب الگ ہیں، جائے وقوع گاؤں سے باہر میدان میں ہے، خوش فضا منظر، سکون کا مقام، اور اسٹیشن سے جسکا نام مردلی

پانچ میل دور ہے، گجرات کے تمام طالب العلم بھی یہاں آرہے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ انشاء اللہ یہ چند سال میں گجرات کا دار العلوم ہو جائیگا

اس دور دراز سفر کے ہر مقام میں جو پایۂ تخت دہلی سے سینکڑوں میل دور ہے، یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ہماری پچھلی اسلامی حکومت کے دھندلے نشان

نمایاں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کے وہ پچھلے خاندان آباد ہیں جنکو سلاطین دہلی نے جاگیریں دے دیکر ہر جگہ بسایا تھا، اور تعلیم، تدریس، یا قضا یا ہدایت رہنمائی

جا بجا آباد کیا تھا، وہ اب تک اسی طرح آباد ہیں، انہیں سے ہر خاندان میں قلمی کتبخانوں کا ذخیرہ پرانے تمدن کی یادگاریں ہیں، اور وہ آبادی میں امتیاز خاص

اور قصبہ میں قاضیوں اور علماؤں کے خاندان آباد ہیں جو اب تک اپنی حقیقت کو سنبھالے ہوئے ہیں لیکن اب تک کے ضرورت ہے کہ یہ لوگ اپنے ماحول کی ضرورتوں کو سمجھیں اور زمانہ کے تقاضوں

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے،

مقالات

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز

ناظرین کو یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے ہم نے اپنے شذرات مین جرمنی کے ڈاکٹر فان کلیوبر کے ایک خط کا ذکر کیا تھا، جسمین موصوف نے اپنے ایک فلکی کرہ کے بنانے والے ضیاء الدین محمد کا حال دریافت کیا تھا، ذیل مین ہم پہلے موصوف کا خط درج کرتے ہین، اور اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ پتہ لگ سکا ہے، اسکو حوالۂ قلم کرتے ہین، اس سلسلہ مین اگر کوئی صاحبِ علم کچھ نئے معلومات پیش کرین گے تو ہمارے شکریہ کا باعث ہوگا،

نقل خط ڈاکٹر فان کلیوبر

"جناب محترم — میرا قصد ہے کہ ایک عربی کرہ کے متعلق جو برلن کے عجائب خانہ مین ہے، کچھ لکھون، اس کرہ پر ایک تحریر ہے جس مین بنانے والے کا نام، تاریخ، اور مقام درج ہے، اس تحریر کا عکس اس خط کیساتھ آپ کی خدمت مین بھیجتا ہون،

چاہتا ہون کہ اس کے بنانے والے کے متعلق تفصیلات معلوم کر دن، کہ یہ کون شخص ہے؟ کیا کوئی معروف مہندس یا منجم ہے؟ کہان کا رہنے والا ہے؟ اس کا زمانہ کیا تھا؟ آیا اس نے اور بھی ایسے کرے تیار کیے ہین؟ اس کا کوئی تعلق آپکے ملک کے رئیس جے سنگھ سوائی سے تو نہین تھا جو خود بڑا نجومی تھا؟

یہان جو کتابین مجھے مل سکین ان مین ان باتون کا پتہ نہ چل سکا لیکن بعض ہندوستانی دوستون نے بتلایا کہ اگر آپ کو لکھون تو ضرور کچھ سراغ لگ سکیگا، مین بہت ممنون ہونگا اگر آپ براہ کرم اپنی معلومات

سے مجھے مستفید فرمائین، مجھے بڑی ہی خوشی ہوگی اور یقین ہے کہ ایشیائی تمدّن سے ہماری محبت اور شغف مین اس سے اضافہ ہوگا، اپنی سیاحتون مین مین خود بھی اس تمدن کا دلدادہ بن چکا ہون،

آپ کا

فان کلیو بر،

ضیاء الدین محمد اسطرلابی ہمایونی لاہوری

اسطرلابی | عربی علم ہیئت کی درسگاہون مین جو آلاتِ فلکی عام طور سے استعمال کئے جاتے تھے، ان مین سب سے مشہور کرہ اور اصطرلاب ہین، ان مین سے کرہ کی ضرورت صرف تعلیم مین پیش آتی ہے، وہ روزمرہ کے استعمال کی چیز نہین، مگر اصطرلاب سے چونکہ آفتاب کا ارتفاع اور دوسرے ستارون کا اندازہ لگاتے ہین، اسلیے یہ ہیئت اور فلکیات کے عالمون، منجمون اور جوتشیون کے روزانہ استعمال مین آتا ہے، اور اسلئے یہ زیادہ متداول ہے، اور اسی بنا پر آلات فلکی کے بنانے والون کا لقب بھی متاخرین مین اسطرلابی مشہور ہوگیا ہے، کہ کرہ کی نسبت "کروی" شخصیت کے بجائے شکل کی نسبت مین اصطلاحاً مستعمل ہے، اس لیے وہ کاریگر اور صناع کے نام کے لیے غیر موزون قرار دیا گیا ہے، اور "اسطرلابی" چونکہ اصطلاح مین کسی شکل کا نام نہین، نہ ہیئت کی کسی اور اصطلاح سے متصادم ہے، اس لئے اس آلہ کی طرف انتساب سے فلکی آلات کے بنانے والے کا لقب بنایا گیا ہے،

ہمایونی | یہ ہمایونی ہمایون کی طرف نسبت ہے، جو آل تیمور کے سلسلہ مین ہندوستان کے تیموری فاتح بابر کا جانشین تھا، سلاطین آل تیمور کو علوم ہیئت سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ المتوفی ۸۵۳ھ نے سمرقند مین مشہور رصدخانہ قائم کیا، جس مین اس عہد کے مشہور علمائے ہیئت قاضی زادہ رومی، غیاث الدین جمشید اور علی بن محمد قوشجی نے تحقیقات کین، اور اس مین جو زیج لکھی گئی اس کا نام زیج الغ بیگی رکھا گیا، بابر نے اپنی تزک مین اس رصدخانہ کے کھنڈرون کا ذکر کیا ہے،

بابر کا بیٹا ہمایون جس کے نام کی طرف اصطرلاب کی نسبت ہے، نجوم و ہیئت کے علوم کا ماہر و عالم تھا، ملا بدایونی

نے منتخب التواریخ مین جو ۱۰۰۴ھ کی تالیف ہے، ہمایون کے حال مین لکھا ہے،

"در علوم نجوم و ہیئت و سائر علوم غریبہ بے نظیر" (جلد اول ص ۴۶۶ کلکتہ)

فرشتہ مین ہے،

"در علم ریاضی علم مہارت می افراشت، مدار صحبتش با علماء و فضلاء بودہ، ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد" (جلد اول، مقالہ دوم ص ۲۴۲ نولکشور)

بادشاہ نے ہیئت کا یہ فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا جو ہیئت کے تمام فنون اور رصد بندی مین ماہر تھے، (ان کا حال بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۳۱ مطبوعۂ کلکتہ مین لکھا ہے)

عراق و ایران کے قیام کے زمانہ مین حکمت و ہیئت کے علوم کے دو نامور عالم ایک وہی الیاس اردبیلی مذکور اور دوسرے شیخ ابوالقاسم جرجانی بادشاہ کے ساتھ تھے، اور اسوقت بھی جب بادشاہ ہندوستان کا تخت کھوکر آوارۂ غربت تھا، ان دونون دانشورون سے قطب شیرازی المتوفی ۷۱۰ھ کی فاضلانہ کتاب درة التاج کا جو فارسی مین حکمت نظری و عملی پر مشتمل ہے، درس جاری تھا (مآثر رحیمی ص ۶۱۲ جلد اول کلکتہ و اکبرنامہ دفتر اول ص ۲۴۲ نولکشور)

اکبرنامہ مین ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، ہمایون ایران کے سفر کے دوران مین جب تبریز پہنچا تو بیگ محمد اختہ بیگی نام اپنے ایک نوکر سے کہا کہ یہ پرانا شہر ہے یہان "کرہ" تلاش کرو، "کرہ" فارسی مین گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہین، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لیکر خدمت شاہی مین حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابان کو دیکھکر ہنس پڑا، ابوالفضل نے اس واقعہ کو ان لفظون سے شروع کیا ہے،

"چون بہ تبریز نزول فرمودند از آنجا کہ توجہ اقدس باصطرلاب و کرہ و سائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت ..... (ص ۲۱۱ نولکشور)

خود بادشاہ علماء کی طرح ہیئت و ریاضی کا درس دیتا تھا، بادشاہ کے مصاحب خاص نورالدین ترخان سفیدونی (المتوفی ۹۹۴ھ) نے جو اس فن کے ماہر تھے، بادشاہ ہی سے اس فن کا درس حاصل کیا تھا، بدایونی مین ہے

"ملا نورالدین ترخان نوری سفیدونی جاگیردار سفیدون از توابع سندھ در علوم ہندسی و ریاضی و نجوم و حکمت ممتاز

و از اجلۂ مصاحبان ہمراز پادشاہ مغفرت پناہ بود" جلد ۳ ص ۱۹۶)

مآثر الامراء (جلد اول ص ۵۳۱ کلکتہ) میں مولٰنا نورالدین ترخان کے حال میں ہے:

"مولانا بفضل و کمال و شجاعت و سخاوت اتصاف داشت، و بہ ہیئت و ہندسہ و اصطرلاب شوق مند بود

. . . . . و صحبتش با جنت آشیانی (ہمایون) کوک گشتہ از جلہ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی

گردید . . . . گاہے پادشاہ ازو استفادہ علوم میکرد، وگاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب

ہمایونی کہ درین فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود"

بادشاہ کو ہیئت و فلکیات سے جو ذوق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ترکی امیر البحر جو سلطان سلیمان

خان کی طرف سے گجرات کے بندر سے پرتگیزون کو نکالنے آیا تھا، اور جسکا جہاز تباہ ہوا، اور اس کو بالآخر خشکی کی راہ سے

ہندوستان، ایران اور عراق کے راہ سے اپنے ملک کو واپس جانا پڑا، اس نے اپنے سفرنامہ مرآۃ الممالک مین ہمایون سے

ملاقات کے سلسلہ مین اس کے نجوم و فلکیات کے شوق کا تذکرہ کیا ہے، ہمایون چاہتا تھا کہ ترکی امیر البحر جو خود بھی فلکیات

کا ماہر تھا، وہ ہمایون کے پاس سے نہ جائے، مگر امیر البحر نے جانے پر اصرار کیا، اس پر بادشاہ نے اس شرط پر رخصت دی:

"برسات کے تین مہینون کے گذرنے کے بعد جنمین راستے ناقابل گذر ہوتے ہین، مین جا سکتا ہون،

اس اثنا مین چاند اور سورج کے گرہنون کا حساب کرتا رہون، اور دہان کے نجومیون کو آفتاب کی گردش

اور خط استوار کے نکات کے پڑھنے مین مدد دون . . . . مین کام مین مصروف ہو گیا،

اور نجومی مشاہدات ختم کئے" (باب ہشتم ترجمۂ مرآۃ الممالک پروفیسر ویمبری)

ہمایون کی بہن گلبدن بیگم جس نے ہمایون کے حال مین ہمایون نامہ لکھا ہے، اس مین ایک موقع پر ذکر ہے

کہ ہمایون نے خود ایک شادی کے لیے اصطرلاب اٹھا کر ستارون کی گردش معلوم کر کے تاریخ سعید مقرر کی،

"غرضکہ بعد از چہل روز در ماہ جمادی الاول ۹۴۸ھ در مقام پاتر روز دوشنبہ نیم روز بود کہ اصطرلاب را

حضرت پادشاہ بدست مبارک خود گرفتہ اند و ساعت سعد را اختیار کردہ" (ص ۵۳ لندن)

ہمایون کو ریاضیات اور آلاتِ ریاضی سے اسقدر انس تھا کہ اس کے رفیق سپہ سالار بیرم خان خانخانان نے اسکی

مدح مین ایک قصیدہ لکھا ہے، اسمین اصطرلاب سے تشبیب کی ہے،

مطلع قصیدہ کہ در باب اصطرلاب گفتہ[1]

آن چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار — آن مرکز میانہ شہابش کند گذار

باآنکہ می کند مہ و خور برابری — آمد بجان ز حلقہ بگوشانِ شہریار

نارد بچشم کوکبۂ آفتاب را — چون مہچۂ لوائے شہنشاہِ نامدار

پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست — ہمچون نگینِ خاتمِ شاہِ جم اقتدار

برکف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی — تا بر قدوم اشرف شاہان کند نثار

شاہِ بلند قدر ہمایون کہ از شرف — بر درگہش سپہر نہد روی افتقار

اس قصیدہ مین چرخ، محور، مدار، بدر، شہاب، ماہ، خور (آفتاب) حلقہ، آفتاب، آسمان، زمین، شرق،

سپہر۔ اسی فن ہیئت اور اصطرلاب کے اصطلاحات ہین،

عام طور سے مشہور ہے کہ ہمایون کتبخانہ کے زینہ سے گر کر مرا تھا، واقعہ یہ ہے کہ پرانی دہلی مین شیرشاہ

نے شیر منڈل کے نام سے ۹۴۸ھ مین بہت بلند سہ منزلہ ایک عمارت بنوائی تھی، اسکی تیسری منزل پر ایک برجی بنی ہے

جو تمام عمارتون سے اونچی ہے[2]، بادشاہ نے اس عمارت کو غالباً اسیلئے کتبخانہ بنا دیا تھا، کہ یہ اونچی عمارت اپنی بلندی کے سبب سے

کسی قدر رصد خانہ کا کام دے، جس شام کو وہ گرا ہے اُس شام کو خیال تھا کہ ستارۂ زہرہ طلوع ہو گا، بادشاہ وہان

ریاضی دانون کیساتھ مباحث مین مصروف تھا، اور سر شام زہرہ کے طلوع کا انتظار تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی،

بادشاہ بیٹھکر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور زخمی ہوا، اور اس زخم سے جانبر نہ ہوا، اکبر نامہ مین ہے،

[1] بدایونی ۳ ص ۱۹۲ کلکتہ [2] آثار الصنادید سر سید مرحوم ص ۱۵ نامی کانپور،

"دآخرہاے روز بربالاے بام کتبخانہ رفتہ . . . . . . جمعے از ریاضی دانان راطلب فرمودند

دآن شب منتظر طلوع زہرہ بودمی خواستند کہ ملاحظہ فرمایند[1]" الخ

اس بادشاہ کے تمام کام فلکیات اور نجوم کے اصول پر ہوتے تھے، دربار کے دنون مین کامون کی تقسیم بھی علم نجوم کی مناسبت سے تھی، غیاث الدین خوندمیر نے ہمایون نامہ مین اور ابوالفضل نے اکبرنامہ مین ان دنون کی تقسیم اور انکے مناسبات نجومی کی پوری تفصیل کی ہے[2]، دربار اور خیمہ وخرگاہ کی ترتیب بھی فلکیات ہی کے اصول سے ہوتی تھی، دربار کے لیے خیمے ایسے بنوائے تھے، جو یونانی ہیئت کے نو دن آسمانون کی پوری نقل تھے، ہر آسمان مین جو ستارے ہین، ان کے نمونے اسمین بنے تھے،

ہمایون کو اس قسم کے اختراعات سے بڑی دلچسپی تھی ایک بساط نشاط" بنایا تھا اس بساط مین فلکی دوائر اور کرات عناصر بنائے تھے، پہلا جو فلک اطلس کی طرف منسوب تھا، سپید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کی مناسبت سے صندلی، پانچوان مریخ کے تعلق سے لال، چھٹا آفتاب کی مناسبت سے سنہرا، ساتوان زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھوان عطارد کے تعلق سے سوسنی، نوان چاند کی مناسبت سے سپید، اس کے بعد اربعہ عناصر کے نقشے تھے، ان مین سے کرۂ خاک مین ساتون اقلیمون کے نقشے تھے، نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ اہل نجوم نے خاص کیا ہے، اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، اسی طرح بارہ برجون کا ایک خیمہ بھی بنوایا تھا، کئی جگہ رصد خانون کے بنانے کا ارادہ کیا، اور بہت سے آلات رصد ترتیب دیئے تھے[3]، انھیں آلات رصد میں سے ایک اصطرلاب بھی

مارچ ومئی ۱۹۰۹ء مین یعنی آج سے چوبیس پچیس برس پہلے الندوہ مین مین نے "مسلمان اور علم ہیئت" پر ایک مضمون لکھا تھا، اس مین سب سے پہلی دفعہ مین نے ضیاء الدین ہمایونی اصطرلابی کا ذکر کیا تھا، اس سلسلہ مین مین نے لکھا تھا،

"ہندوستان مین اصطرلاب کا رواج ہمایون نے دیا، ہمایون علم ہیئت مین نہایت ماہر تھا، اُسنے ایک

[1] اکبرنامہ نولکشور ص ۹۹ و ۳۰۰ و مآثر رحیمی جلد اول ص ۶۰۹، کلکتہ [2] دیکھو الیٹ کی تاریخ ہند جلد ۵ ص ۱۱۶ [3] اکبرنامہ دفتر اول،

خاص طرز کا اصطرلاب بنایا تھا جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہین، چنانچہ ندوہ کے کتبخانہ مین جو ایک قدیم اصطرلاب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے "عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ اللہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری سنہ ۱۰۵۹ھ[1]"

افسوس ہے کہ میرے اس مضمون مین اس بیان کا حوالہ مذکور نہین، اس وقت ہر چند مین نے اس کے حوالے جا بجا کتابون مین تلاش کئے، مگر اب تک کامیابی نہین ہوئی ہے، علامہ غلام حسین جونپوری الموجود سنہ ۱۲۵۰ھ نے جامع بہادرخانی مین لکھا ہے، کہ "صناعانِ متأخرین نے اصطرلاب مین یہ اصلاحین کی ہین[2]، کیا عجب کہ ان متاخرین سے اسی ہمایونی اصطرلاب کی طرف اشارہ ہو،

ہمایون کی خدمت مین جو صناعِ فلکیات کے یہ آلے اور نقشے اور کرے بناتے تھے، ان کے نام تاریخون مین جگہ نہین پاسکے ہین، صرف ایک مولنا مقصود ہروی کا نام آئین اکبری مین ہے کہ

"از پرستاران جنت آشیانی (ہمایون) بود . . . . . اسطرلاب وکرہ دسطرے چند چنان برساخت

کہ کاروبدگان راشگفت درآورد" (ج ۱ ص ۳۱ نولکشور)

ضیاء الدین اوراسکا خاندان

ضیاء الدین اور اس کے خاندان کا کوئی پتہ ہم کو اب تک تاریخون اور تذکرون سے نہین ملا ہے، لیکن ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے بنے ہوئے کرون اور اسطرلابون پر اس کے نام ونسب کا جو سلسلہ لکھا ملتا ہے، اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ضیاء الدین کا پردادا اللہداد ہمایون کے عہد کا صناع تھا، اور جو ہمایونی طرز کے کرے اور اصطرلاب تیار کرتا تھا، ضیاء الدین اور اس کے باپ قائم محمد کے حسب ذیل مصنوعات کا پتہ ہم کو ملسکا ہے؛

قائم محمد کا بنایا ہوا ایک اصطرلاب کلکتہ مین قاضی عبید الباری کے پاس ہے[3]، اس اصطرلاب پر حسب ذیل کتبہ ہے؛

۱- "عمل قائم محمد بن عیسیٰ بن اللہداد اصطرلابی ہمایونی سنہ ۱۰۳۲ھ"

[1] الندوہ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۲ [2] جامع بہادرخانی ص ۵۰۱، کلکتہ، [3] یہ کلکتہ کے ایک پرانے خاندان کی یادگار ہین، ان کے اصطرلاب کی اطلاع پروفیسر محفوظ الحق پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجی ہے،

اسی اصطرلاب کے دوسرے گوشہ پر ہے: "سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری"

اس کا بنایا ہوا ایک کرۂ فلکی بانکی پور کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، اس پر یہ عبارت درج ہے،

۲- "صنعۃ اقل العباد قائم محمد ابن عیسیٰ ابن الہداد اسطرلابی لاہوری ہمایونی" سنہ ۱۰۳۰ھ

کرہ کی دوسری جانب یہ عبارت کندہ ہے،

- تمت این کرہ مکمل مشتمل بیک ہزار و بست و دو کواکب ثوابت کہ جمیع ازان چہل و ہشت صورت مرصودہ نمودہ اند، اہل د؟) علماء و حکماء تنجیم چنانچہ مرصود رصد مرزا الغ بیگ است، و بر تقویم ہر کوکب تا بہ سہ درجہ زیادہ کردہ ایم بحساب حکماء علماء این فن تا باین تاریخ سنہ ۱۰۴۷ھ"

یہ کرہ خالص پیتل کا بنا ہوا ہے، ہر کوکب کے پاس چاندی کی کیل ہے، اور ہر برج کی شکل بھی بنی ہوئی ہے، اور برجون کے پاس اس طرح سے جڑی ہین کہ انکی شکلین متوہم ہوجاتی ہین،

قائم محمد کے بیٹے ضیاء الدین محمد کے بنائے ہوئے حسب ذیل کردن اور اصطرلابون کا حال ہم کو معلوم ہوا ہے جنکو ہم سنہ کی ترتیب سے نیچے درج کرتے ہین،

۱- اس کی بنائی ہوئی سب سے قدیم صنعت ایک فلکی کرہ ہے، جو اس وقت پھلواری ضلع پٹنہ مین مولوی یوسف صاحب رضوی کے پاس ہے، یہ کرہ خالص پیتل کا ہے، اور ہر ستارہ کے پاس چاندی کی ایک کیل گڑی ہے تین پاؤ پختہ وزن ہے، اس خاندان مین یہ کرہ سنہ ۱۲۳۸ھ سے چلا آرہا ہے، کرہ پر حسب ذیل عبارت نقش ہے،[1]

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ، ابن ملا الہداد، اسطرلابی، ہمایونی لاہوری، فی سنہ ۱۰۵۶ھ"

۲- اس کے بعد اس کی بنائی ہوئی دوسری چیز ایک اصطرلاب ہے، جو اس وقت ندوۃ العلماء کے کتبخانہ مین ہے، اس اصطرلاب پر نام و تاریخ اس طرح ہے،

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۵۹ ہجریۃ"

[1] اس کرہ کی واقفیت کے لیے ہم مولوی سید احمد عروج، ہاشمی، صدر منزل، مہندرو، پٹنہ کے ممنون ہین،

۳- اس کا بنایا ہوا دوسرا اصطرلاب نواب صدر یار جنگ مولنٰا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے کتبخانہ (حبیب گنج ضلع علی گڑھ) مین ہے، اسکی عبارت اور تاریخ یہ ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد، اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۳ ہجری"

۴- اسی سال کا بنایا ہوا اسکا کرہ رامپور مین ایک حکیم صاحب کے پاس تھا اور جواب طبیہ کالج علی گڈھ مین ہے، اس کا حلقہ ٹوٹ گیا ہے، مگر کرہ سالم موجود ہے، اس پر یہ عبارت ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۶۳ھ"

۵- اس کی چوتھی فلکی یادگار وہ کرہ ہے جسکا حال ڈاکٹر گلوبر نے ہم کو لکھکر اس کے فوٹو کے ساتھ بھیجا ہے، کرہ ہے، جو اس وقت جرمنی کے پایہ تخت برلن کے عجائب خانۂ انسانی مین ہے، اس پر کتبہ یہ ہے،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد ابن قائم محمد ابن ملا عیسیٰ ابن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری، فی سنہ ۱۰۷۱ ہجری"

اس کے بعد سنہ ۱۰۷۴ھ کے بنائے ہوئے اس کے چار اسطرلابون کا حال ہم کو معلوم ہے جو اس وقت یورپ اور ہندوستان مین موجود ہین،

۶- ایک مولانا ابوبکر صاحب جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کے پاس ہے، یہ نسبۃً چھوٹا ہے، اور اس پر عبارت یہ ہے:۔

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن شیخ الہداد، اسطرلابی، ہمایونی، لاہوری، فی سنہ ۱۰۷۴ھ"

۷- دوسرا ریاست رامپور کے شاہی کتب خانہ مین ہے، اس کے حروف کہین کہین سے گھس گئے ہین، اور جو پڑھے جاتے ہین وہ یہ ہین،[1]

[1] اس اطلاع کے لیے ہم مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی، نائب ناظم کتبخانۂ شاہی رامپور کے ممنون ہین،

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد . . . فی سنہ ۱۰۴۲ھ"

۸ - اس سنہ کا تیسرا اصطرلاب وہ معلوم ہے جو سنہ ۱۹۳۱ء کے ایرانی فنون کی نمایش منعقدہ لندن (برلنگٹن ہاؤس

اگزیبشن) مین پیش ہوا تھا، اور جسکا ذکر نمایش مذکور کی مطبوعہ فہرست ص ۱۹۳ مین موجود ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی

سنہ ۱۰۴۲ ہجری"

فہرست مذکور کے مرتب نے الہداد کے نام کے پڑھنے مین غلطی کی ہے، اس ہندوستانی نام کو جو "الٰہ"

اور "داد" کا مجموعہ ہے، اور جس کے معنی عطیۂ الٰہی کے ہین، "الحداد" پڑھا گیا ہے، جس کے معنی عربی مین لوہار کے

ہین، اور پیتل کی صناعی کی مناسبت سے شاید یہ الحداد موزون سمجھا گیا ہے، مگر یہ صریحاً تحریف ہے،

۹ - اسی سنہ کا بنایا ہوا اسکا چوتھا اصطرلاب جو بہت بڑا ہے، بانکی پور لائبریری مین ہے، عبارت یہ ہے

"عمل اقل العباد ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہداد اسطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۴۲ھ"

نتائج اوپر کے معلومات اور کتبون کی بنا پر حسب ذیل نتیجے برآمد ہوتے ہین،

ان لوگون کا وطن لاہور (پنجاب) تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے، ضیاء الدین، اس کا باپ قائم محمد، اس کا باپ

ملا عیسیٰ، اس کا باپ ملا شیخ الہداد، کتبون کی عبارت اور لفظ "ملا" کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صفت علم سے متصف

تھے، بدایونی مین ایک شیخ الہداد لنگرخانی لاہوری کا حال ان لفظون مین ہے،

"منسوب بمحلہ ایست از لاہور (محلۂ لنگرخان لاہور کا ایک محلہ ہے) در اکثر علوم متداولہ ماہر و متبحر

. . . . . وبدرس مشغول است، ہرگز بخانۂ ارباب بیمروت دنیا نرفتہ و از ملوک حاجت

نخواستہ و مدد معاش نگرفتہ، عمرش قریب بہشتاد است"

بدایونی نے اپنی کتاب سنہ ۱۰۰۴ھ مین لکھی ہے، اس حساب سے ان شیخ الہداد کی پیدایش تقریباً سنہ ۹۲۴ھ

ل اسکی اطلاع بھی ہم کو پروفیسر محفوظ الحق نے دی ہے،

اور ہمایون کی حکومت کا زمانہ سنہ ۹۳۷ سے ۹۶۳ھ تک ہے، اس بنا پر یہ ہمایون کے سامنے پچیس تیس برس کے جوان

ہونگے، تاہم ان کو وثوق کیساتھ ضیاء الدین کا پردادا شیخ الہداد نہین کہا جا سکتا،

ضیاء الدین اور اس کے بزرگون کے نامون کو سلاطین کے نامون کیساتھ ملانے سے یہ نسبت پیدا ہوتی ہے،

۱ - شیخ الہداد،	۱ - بادشاہ ہمایون (سنہ ۹۳۷ / ۱۵۳۰ - سنہ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء)
۲ - ملا عیسیٰ	۲ - بادشاہ اکبر (سنہ ۹۶۳ / ۱۵۵۵ء - سنہ ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء)
۳ - قائم محمد	۳ - بادشاہ جہانگیر (سنہ ۱۰۱۴ / ۱۶۰۵ء - سنہ ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء)
	۴ - بادشاہ شاہجہان (سنہ ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء - سنہ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۶۵ء)
۴ - ضیاء الدین محمد،	۵ - بادشاہ عالمگیر (سنہ ۱۰۶۸ / ۱۶۵۷ - سنہ ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۶ء)

ان مین سے دو کی تاریخین ہم کو ملی ہین، اور وہ دونون اس قیاس کے مطابق ہین، قائم محمد کے پہلے اسطرلاب

کی تاریخ سنہ ۱۰۳۴ھ سنہ ۲۱ جلوس جہانگیری ہے، اس کے دوسرے کرہ کی تاریخ سنہ ۱۰۴۰ھ ہے، اس سے ثابت ہے کہ

اس نے جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ پایا ہے،

ضیاء الدین کے پہلے کرہ پر سنہ ۱۰۵۰ھ اور آخری کامون پر سنہ ۱۰۶۷ھ منقوش ہین، جس سے اس کے عمل و صنعت کا

زمانہ کم از کم سترہ برس تو بالیقین ہے،

ان لوگون کا اس کثرت سے آلات بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ لوگ علمائے مدرسین یا علم ہیئت کے عام شائق و ماہر نہ تھے، بلکہ

پیشہ ور کاریگر تھے، ایک ایک سال مین کم از کم چار چار اصطرلاب یا کرے بناتے تھے، جیسا کہ سنہ ۱۰۶۲ھ مین اسکے ایک اصطرلاب اور ایک کرہ کا

اور سنہ ۱۰۴۲ھ مین اوس کے چار اصطرلابون کا پتہ ہمکو معلوم ہے،

ڈاکٹر کلوبر کا یہ شبہہ کہ ضیاء الدین یا اس کے کرہ کو راجہ جے سنگھ سوائی کے رصد خانہ سے تو کوئی تعلق نہ تھا، بے بنیاد ہے، اس

رصد خانہ کی تعمیر محمد شاہ کے حکم سے راجہ جے سنگھ رئیس جے پور و صوبہ دار آگرہ و مالوہ نے سنہ ۱۱۳۶ھ مطابق سنہ ۱۷۲۴ء مین کرائی تھی،

یعنی برلن کے کرہ کی ساخت سے چھیاسٹھ برس بعد، اور ضیاء الدین کے پہلے بنائے ہوئے کرہ (موجودہ پھلواری ضلع پٹنہ) کی ساخت کے اٹہتر برس بعد،

وجودِ روح "رحانیین" کے "نقطۂ نگاہ" سے

از

جناب محمد اصغر صاحب، انصاری، بی اے بھوپال

(۲)

اہل سائنس کی تحقیق نے مادیین کے اس نظریہ کو بالکل ہی کمزور کردیا ہے کہ اس عالم میں مادہ اور ماد
اشکال کے سوا کچھ نہیں ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم صرف مادہ ہی کے واسطہ سے اس کائنات سے با
ہیں، لیکن اس کا یہ نتیجہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کائنات تمامتر مادہ ہی مادہ ہے یا مادہ اس کائنات کی اصل
اگر ہم نے ایسا خیال کرلیا تو اس کے معنی تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے کہ ہم اصل محرک کو اسکی علامتوں اور
سے خلط ملط کردیتے ہیں، اسکی مثال تو یہی ہوگی کہ ایک مقناطیسی برق پیما کی سوئی کا پھرنا ہی دراصل برق کی ح
ہے، اگر تم کو ایک لوہے کا ٹکڑا حرکت میں نظر آئے تو اس سے ایک مقناطیسی حلقہ (AGNETIC FIELD
کا وجود تو ثابت ہوتا ہے، لیکن کوئی صاحب عقل سلیم یہ نہیں کہہ سکتا کہ خود یہ آہنی ٹکڑا ہی کوئی اصل شے
ہم اپنے آپ کو ایک بہت ہی غلط راستہ پر ڈالدینگے اگر مقناطیس و برق کی حقیقت اور اصلیت کو صرف اسی
مظاہر و حرکات ہی تک محدود کردیں لیکن کسقدر افسوس ہے کہ ذی حیات اجسام کے مطالعہ میں ان ماد
کا یہی رجحان پایا جاتا ہے کہ یہ حرکات ہی زندگی کی اصل حقیقت ہیں، حالانکہ یہ تو صرف زندگی کی علامات ہ
بذاتِ خود زندگی نہیں، ہمارے دماغ کے اندر جو عمل کیمیائی ہوتا ہے اور جو عناصر و سالمات کا باہمی تغیر ہم
کرتے ہیں وہ خیال کا باعث نہیں ہے بلکہ خیال اس تغیر کا باعث و موجب ہے،

گذشتہ بیانات کا خلاصہ یہ ہوا کہ مادہ بذاتِ خود بیجان اور بیکار ہے یعنی وہ خود ان اثرات کا

جو "خلاء" سے اس تک پہنچتے ہیں، اگر اس پر کوئی بیرونی قوت عمل نہ کرے تو نہ اس میں کوئی حرکت پائی جائے گی،
اور نہ اپنی کسی حالت و کیفیت کو بدلنے کی وہ کوئی اہلیت رکھتا ہے، جس قدر تغیرات بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ
در اصل "خلاء" کی ایک غیر معلوم قوت کا عمل ہے، اسی نتیجہ کی تائید مزید زمین کی کشش ثقل، برقیات، مقناطیسیت
اور ذرہ کے مطالعہ سے بھی ہوتی ہے، کچھ عرصہ پہلے اگر اہلِ علم کی کسی مجلس میں یہ دعویٰ کیا جاتا کہ مادہ بذاتہ جامد محض
ہے تو شاید اس کا جواب بے التفاتی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، لیکن آج ہر ماہرِ طبعیات کے لیے یہ ایک روزمرہ کی
بات ہے کہ روشنی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ خلاء کی ایک غیر معلوم کیفیت کا نتیجہ ہے، برق و مقناطیس اور
جذب و کشش کے جملہ مظاہر دراصل کسی ایسی ہی قوت کا اثر ہیں جو مادہ کے واسطہ سے عمل کر رہے ہیں، یعنی آج
پورے وثوق اور یقین کیساتھ یہ تسلیم کیا جاتا ہے، کہ مادہ میں زندگی کی حرکت مادہ کا کوئی ذاتی وصف نہیں ہے،
کہ یہ چیز باہر سے آتی ہے،

آئیے، انھیں متذکرۂ بالا نتائج کو ہم اُن مظاہرِ حیات پر منطبق کریں جو اجسام عضوی میں ہم مشاہدہ کرتے
یں، اسی تشریح کے ماتحت مظاہرِ حیات محض مادہ کے مرہونِ منت نہیں ہیں بلکہ جسطرح غیر عضوی اور غیر ذی روح
جسام میں مادہ پر ایک ایسی دوسری قوت عامل ہوتی ہے جو اس مادہ سے بالاتر ہے، اسی طرح ہمارے دماغ کے
ر بھی جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ کسی ایسی ہی قوتِ متصرفہ کے باعث ہوتا ہے جو ہمارے دماغ کے مادی وجود پر
عامل و متصرف ہے اور اس بنا پر ہمارے دماغ کے سالمات و جواہر، خلایائے دماغی اور ہمارا نظامِ عصبی اس کے
وا کچھ نہیں ہے کہ اُس قوتِ مدبرہ کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے جس کی حقیقت سے ہم ناواقف ہیں اور
جسکا ہم ابتک کوئی علمی نام بھی نہیں رکھ سکے، اس قوتِ مدبرہ کا براہِ راست ہم کو کوئی علم نہیں ہوتا ہے، بلکہ
یہ ان مادی مظاہر ہی کے واسطہ سے ہمارے علم میں آتی ہے جبکہ ہم نظامِ عصبی مراکزِ دماغی وغیرہ میں مشاہدہ کرتے
ہیں، لیکن مادہ کے اوپر عمل کرنے والی قوت کا شعور و ادراک براہِ راست ہم کو نہیں ہوتا، یہ چیز تو صرف استدلال
و استخراج ہی کی بنا پر سمجھی جاسکتی ہے اور جس طرح ہم ایک برقی میدان کے خواص و کیفیات کو صرف ان اثرات

سے اخذ کرتے ہیں جو کسی برق بار جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور جسطرح ہم برق اور مقناطیس کی اصلیت کا پتہ انھیں اثرات سے چلاتے ہیں جو اجسام مادی پر مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح ہم اس حیات بخش قوت کے وجود کو ان اثرات سے اخذ و مستنبط کرتے ہیں، جنکو ہم مظاہر زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ قوت حیات دراصل بنیادی چیز ہے جس کی بنا پر انسان کی دماغی مشین کی توجیہ و تشریح تو کیجا سکتی ہے، لیکن خود اس قوت حیات کی تعبیر دماغی مشین کے ذریعہ ہرگز نہیں کیجا سکتی، ہمارا یہ میلان کہ یہ مادی مشین ہی اپنے اندر ابتدا و اولیت رکھتی ہے، واقعات و حقائق کے نزدیک مفتوح ہو جاتا ہے، آج سے پہلے ہم عفونت کا سبب یہ سمجھتے تھے کہ مادہ میں عمل کیمیائی کے باعث تخمیر و عفونت پیدا ہوتی ہے، لیکن پاسٹیور (PASTEURE) کی تحقیقات نے اس نظریہ کو بالکل لغو ثابت کر دیا ہے، عفونت و تخمیر محض کیمیائی عمل نہیں ہے بلکہ ان تمام مظاہر کا سبب "زندہ جراثیم" کا وجود ہے، انھیں کے باعث یہ خرابی پیدا ہوتی ہے،

۵۰- اسی قسم کے شواہد و تجربات کی بنا پر پروفیسر وہائٹ فیلڈ (WHITEFIE-LD) جیسے مشہور و مستند طبیعی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ تمام کائنات ایک ذی حیات عضو ثابت کیا جا سکتا ہے،

الغرض اصل چیز ہمارے جسم و دماغ کی ساخت نہیں ہے بلکہ وہ قوت متصرفہ ہے جو جسم و دماغ کی اس مشین کو چلاتی ہے، اسی قوت متصرفہ کو ہم روح کے نام سے پکارتے ہیں، گو ہنوز یہ اصطلاح اہل سائنس میں رائج نہیں ہوئی ہے،

گذشتہ بیانات سے اس قدر واضح ہو گیا ہے کہ یہ نظریہ کہ انسانی روح کی حقیقت سوائے مادہ کے کچھ نہیں، قطعاً بے بنیاد ہے، اور ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے شواہد اور دلائل معدوم ہیں لیکن ہنوز دو ایک شبہات اس سلسلۂ بحث میں ایسے باقی رہگئے ہیں جنکا جواب دینا لازمی ہے،

یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ہمارے دماغ کی اندرونی ترکیب و ساخت اور اس کا عمل مادی سامان کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی غیر معلوم چیز کا نتیجہ ہے جسکو قوت ایتھر وغیرہ ناموں سے تعبیر کیا جا

اور گو اس ایتھر یا قوت وغیرہ کے متعلق یہ نہ کہا جا سکتا کہ وہ مادی ہے، لیکن بہر صورت یہ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح یہ غیر معلوم قوت ہمارے دماغ کے باہر اس عالم ظاہر میں کارفرما ہے، اسی طرح ہمارے دماغ کے اندر کارفرما ہے، اسلئے اس سے یہ نتیجہ صراحتہً اخذ ہوتا ہے کہ ہمارا نفس اور یہ عالم مشہود دراصل ایک ہی جنس سے ہیں یعنی وہی غیر معلوم قوت ہی ان دونوں چیزوں کا باعث اور ان کے عمل و ظہور کا موجب ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہم (نفس انسانی) اصلاً اس عالم ظاہر سے مختلف ہیں واقعہ کے خلاف قرار پاتا ہے، اور جب اس استدلال کی بنا پر ہماری اور اس عالم مشہود کی اصل و ذات ایک قرار پائی تو پھر یہ محض لفظی نزاع رہ جاتا ہے کہ ہماری اصل مادی ہے یا نہیں، نتیجہ بہرحال ایک ہی ہے، وہ قوت جس طرح کسی غیر معلوم قانون کے تحت میں ہمارے اندر حسیات، جذبات، اور شعور پیدا کرتی ہے، اسی طرح اس عالم مشہود کے دیگر مظاہرات کون و فساد کا باعث بھی ہوتی ہے، اور گو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مادی نظریہ کے ٹوٹ جانے سے ہماری نگاہوں کے بہت سے حجاب بھی دور ہو گئے اور مادیت کے اس طلسم فریب کے شکست نے ہم کو حقیقت کے قریب تر کر دیا، تاہم روحانیین کا اصل دعویٰ ہنوز تشنۂ بحث ہے یعنی اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہماری اصل مادی ہے یا غیر مادی بلکہ تصفیہ طلب امر تو یہ ہے کہ وہ شئے جسکو عرف عام میں رُوح کہا جاتا ہے، اس کا وجود کوئی مستقل بذات وجود ہے یا نہیں، ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور بقول ڈیکارٹس "میں سوچتا ہوں اسلئے میں موجود ہوں" اسی سوچنے کے معنوں کو وسیع کر لیجئے، میں محبت کرتا ہوں، میں نفرت کرتا ہوں، میں ایک خواہش رکھتا ہوں، میں ایک ذی ارادہ ہستی ہوں، میرا ارادہ اس دنیا میں بعض تغیرات کا باعث بھی نظر آتا ہے، الغرض یہی وہ اوصاف ہیں جو مجھ میں ایک "شخصیت" یا "ذات" کی نسبت پیدا کر دینے کا موجب ہیں، اس لیے سوال یہ ہے کہ کیا یہ تشخص یا ذات دراصل کوئی ایسی حقیقت ہے جسکو بذاتہ ایک عامل ہستی تصور کیا جاتا ہے، یا یہ محض دھوکا اور فریب ہے اور یہ ہستی ایک دوسری نامعلوم قوت کی (جو خواہ مادی ہو یا نہ ہو) مرہون منت ہے، اور جس طرح بیجان مادہ اس قوت کے اثرات سے معذور و مجبور رہے اسی طرح میں بھی مجبور و معذور ہوں،

یا بہ الفاظ دیگر یہ کہئے کہ مجھ میں اور بیجان مادہ میں صرف اس قدر فرق ہے کہ مظاہر مادی اور میری شیون نفس
صرف اشکال وحالات کا فرق ہے، اصل اصول کا کوئی فرق نہیں،

یہ بحث گذشتہ مباحث سے زیادہ دقیق اور بہت زیادہ پیچیدہ ہے، اس بحث کے سلسلہ میں ہمار
توجہ بار بار روح کی حقیقت کی طرف منتقل ہو جائے گی، لیکن اس جگہ یہ واضح کر دینا چاہئے کہ ہمارا مبحث رو
کی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ بتا دینا ہے کہ "روح کا ایک مستقل وجود ہے" "حقیقتِ روح پر" بحث کرنا صرف
موضوع سے خارج ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آج تک کسی کی بھی اس حقیقتِ مستور تک رسائی نہیں ہوئی ہے،
کی سب سے بڑی کاشفِ اسرار کتاب میں جو زیادہ سے زیادہ بات اس بارہ میں کہی گئی ہے وہ صرف اس قد

قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، بحث ونزاع کا اصلی میدان یہ ہے کہ ایک فریق سرے سے
کے وجود کا منکر ہے، اور اس نے اپنے انکار کو بعض علمی نظریوں پر مبنی کر رکھا ہے، اور دوسرا فریق اس کے و
مقر ہے اور اس اقرار سے یہ نتیجۂ فرعی نکالتا ہے کہ یہ وجود اجسام مادی کیطرح فنا نہیں ہوتا بلکہ جس امر کو
کہتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس روح نے اپنا لباس ومکان بدل دیا ہے، منکرین روح کے ن
علمی کی کمزوریاں تو آپ پر ظاہر ہو چکی ہیں، لیکن اس سے زائد سے زائد جو نتیجہ مترتب ہوا وہ صرف یہ
روح کے انکار پر کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس سے روح کا وجود تو ثابت نہیں ہوتا، سطورِ ذیل میں ہم
مبحث پر کچھ عرض کرنا ہے،

اجازت دیجئے کہ اس موقع پر بحث کی وسعت کو سمیٹ لیا جائے، سیدھا سادہ سوال یہ
کہ انسان بذاتہ "عامل ہستی" ہے یا "معمول" ہے، اور اگر یہ "عامل ہستی" ہے تو اس کا یہ عمل خود اسکے وجو
اصل حقیقت کے باعث پیدا ہوتا ہے یا یہ کسی بیرونی قوت یا اثر کا معمول ہے، اگر یہ معمول ہے تو پھر اس کا
کوئی مستقل شے نہیں ہے بلکہ دیگر اجسامِ ظاہری ہی کی ایک صنف ہے لیکن اگر یہ "عامل بالذات" ہے اور ک

اثر کا معمول نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ عامل بالذات حقیقت انسان کا اصل اصول ہے، تسمیہ کا سوال محض ثانوی
اہمیت رکھتا ہے، خواہ تم اس کو روح کہو یا کوئی اور نام رکھ لو مراد ومفہوم ایک ہی رہیگا، یعنی یہی عامل بالذات
حقیقت سوچتی ہے، یہی ارادہ کرتی ہے، یہی محبت کرتی ہے، یہی نفرت کرتی ہے، یہی ہمارے اعمال ظاہری
وباطنی کا موجب ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر اخلاقی احتساب جاری کیا جا سکتا ہے، یہی، سزا وجزا
کی مستوجب ہے اور اگر دلائل موجود ہوں تو یہی "عامل بالذات" حقیقت، مرنے کے بعد زندہ بھی رہتی ہے،

جب ہم اس مسئلہ پر اس نوعیت کے تحت میں غور کرتے ہیں تو جو چیز سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے
وہ "قوتِ ارادی" ہے، نفس انسانی کا ارادہ ایک ایسی متعارف حقیقت ہے کہ کسی مزید تعریف کی محتاج نہیں ہے
لیکن علمی حیثیت سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ارادہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، اگر بقول مادیین
"ارادہ" مادی سالمات کے باہمی عمل کا نتیجہ ہے یا ایسی ہی کسی دوسری غیر معلوم قوت کے باعث اس کا ظہور
ہوتا ہے، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک انسان اپنے ارادہ پر قادر نہیں ہے، بعض خارجی طبعی مؤثرات کے باعث
ہمارے دماغ کے بعض مخصوص سالمات میں باہمی ایک عمل ہوتا ہے اور اس کے باعث ایک خاص ارادہ پیدا
ہو جاتا ہے، ہمارے ارادوں کے باہمی اختلاف اور تنوع کی توجیہ بھی یہی کیجا سکے گی کہ وہ سالمات جو ارادے
پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں ان کے ائتلافِ باہمی کی نسبت میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے وہی ہمارے ارادے
میں بھی تغیر کا باعث ہوتا ہے، اس توجیہ کو درست تسلیم کر لینے کا ایک بالکل منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب
اسباب متقدم کی بنا پر ہمارے ان سالمات میں جو ارادہ پیدا کرنے کا موجب ہیں، ایک عمل کیمیائی ہو گیا تو
ہم کو اس ارادے کے تبدیل کر دینے پر کوئی قدرت نہ ہونا چاہئے اور جب ہم ارادہ نہیں بدل سکتے تو ہم
ارادے کے نتائج کو بھی نہیں بدل سکتے، ہمارے تمام اعضاء وجوارح ہمارے ارادے کے ماتحت ہیں،
تمثیلاً یوں سمجھئے کہ اندرونِ معدہ ہضم غذا کا عمل جاری ہے جس کے باعث کیمیائی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان
تبدیلیوں کے باعث معدہ کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی ضرورت کا احساس دماغ تک منتقل ہوتا ہے،

جس کے باعث ہمارے اعصاب حرکتی میں حرکت پیدا ہوتی ہے، اور ہم پیالہ اٹھا کر پانی پی لیتے ہیں،

اس تمام توجیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس شے کو ارادہ کہا جاتا ہے وہ دراصل "اضطرار" کے سوا کچھ نہیں ہے
اسی توجیہ کے تحت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ ارادے کے پیدا ہونے کا کوئی نہ کوئی مقدم طبعی (نہ کہ نفسی) سبب
ہونا لازمی ہے اور جب وہ اسباب جمع ہو جائیں تو پھر ارادہ بھی ایک مخصوص قسم کا پیدا ہوگا، اور اس میں تغیر
نہ ہو سکیگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے تجربات زندگی اس نتیجہ کے مخالف ہیں، ہم میں سے ہر شخص بداہتہً جانتا
ہے کہ ہم اپنے ارادوں میں مجبور نہیں بلکہ مختار ہیں، متذکرۂ بالا مثال ہی کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ہم میں سے
ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ہم اس پر مجبور نہیں ہیں کہ جب ہمیں پیاس لگے تو ہم اضطراراً پانی پی لیں یعنی یہ نہیں ہوتا
کہ پیاس لگتے ہی ہمارا ہاتھ کاسۂ آب پر جا پڑے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارا ہاتھ کاسۂ آب کی طرف بڑھتے بڑھتے
لیکن عین اس وقت ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ اس پانی میں سم ملا ہوا ہے فوراً ہمارا ہاتھ ٹھٹک کر
رہجاتا ہے۔ یہ کیوں ہوا، اگر ہمارا ارادہ دراصل مقدم اسباب کا ایک نتیجہ تھا تو اس میں اسوقت تک تغیر نہیں
ہو سکتا تھا جب تک دوسرے ایسے اسباب مترتب نہ ہوتے، جو اس ارادے کی نفی کر کے دوسرا ارادہ پیدا
کردیتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر اس کے کوئی دوسرا سلسلۂ اسباب پیدا ہوا ہو ہم اپنے ارادہ کو بدلدیتے ہیں،
جیسا کہ متذکرۂ بالا مثال سے واضح ہو رہا ہے، تم کہوگے کہ اس مثال میں بھی ارادے کی تبدیلی کا سبب
یہ ہوا کہ عین وقت پر یہ آواز کان میں آئی کہ "پانی سم آلود ہے"، بیشک یہ ایک سبب ہے، لیکن یہ کوئی طبعی
سبب نہیں ہے، بلکہ نفسی سبب ہے اور بحث جو کچھ ہے وہ طبعی اسباب سے ہے، یعنی وہ اسباب جنکی اصل
نوعیت مادی ہو، یہ "آواز" کہ پانی میں سم ہے مادی حیثیت سے اس کے سوا کیا ہے کہ ہوا میں کچھ امواج
پیدا ہوگئیں اور وہ بذریعہ اعصاب دماغ تک پہنچ گئیں، فرض کرو کہ یہی آواز تمہارا ایک دوست مذاق میں
بلند کرتا لیکن اس صورت میں یہ نتیجہ پیدا نہ ہوتا، تمہارے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوتی، درانحالیکہ آواز وہی
ہے، امواج ہوا کی نوعیت یکساں ہے اور اس کے باعث ہمارے دماغ میں جو تغیرات کیمیائی وغیرہ پیدا

ہونے چاہئیں وہ سب یکساں ہیں، لیکن نتیجہ مختلف مرتب ہوتا ہے جس سے صرف ایک یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان
کا ارادہ بیرونی اسباب طبعی کا پابند نہیں ہے اور یہی صفت انسانی اس نتیجہ تک ہم کو پہنچاتی ہے کہ انسان بہر حال
ایک معمول مخلوق نہیں ہے بلکہ بیشتر حالات میں ایک عامل بالذات وجود ہے، ہمارے روزمرہ کے شواہد
اس کی تائید کرتے ہیں، ہم اپنے جذبات رذیلہ کے دبانے پر قدرت رکھتے ہیں، ان کی جگہ اعلیٰ جذبات کو اپنے
اندر جگہ دیسکتے ہیں، اسی عامل بالذات قوت کی بدولت ہم تہذیب وارتقائے نفس کا کام کرتے رہتے
ہیں، ہماری تربیت کا سارا دارمدار اسی قوت انتخاب اور ارادے پر ہے، سزا و جزا کا موجب یہی قوت ارادی
ہے اور یہی وہ قوت ہے جو ہم کو مجبور و معذور مادہ کی صف سے نکال کر ذی اختیار مخلوق کی صف میں لا کر
کھڑا کر دیتی ہے،

قوت ارادی سے ملی جلی ایک قوت ہم میں اور ہے، یعنی قوت شعور و ادراک، علم الحیات کے مسلمات
میں یہ بھی ہے کہ فطرت کسی چیز کو بیکار نہیں پیدا کرتی، اس مسلمہ کے تحت میں قوت شعور کی بھی کوئی نہ کوئی ضرورت
ہونی چاہئے، لیکن اگر انسان ایک مشین کے سوا کچھ نہیں تو پھر قوت شعور ایک بیکار شے ہو جاتی ہے، اگر ہمارے سارے
اعمال وافعال دراصل مشین کی طرح ہم سے سرزد ہوتے رہتے ہیں اور انسان ایک ایسی مشین ہے جس کا ہر
کیل کانٹا اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہے تو پھر قوت شعور کا وجود قطعاً غیر ضروری ہے جس طرح ایک موٹر گاڑی
اپنا سب کام بغیر قوت شعور کے انجام دیتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنے تمام اعمال انجام دیسکتا تھا، لیکن
قوت شعور انسان کا بہت ہی متعارف وصف ہے اس لئے علم الحیات کے اس اصول کی بنیاد پر کہ فطرت کسی
چیز کو بیکار پیدا نہیں کرتی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے متعلق منکرین روح کا یہ قیاس قطعاً غلط ہے کہ انسان
ایک ایسی مشین کے سوا کچھ نہیں جو خلایائے دماغی کے کل پرزوں کے بل پر چل رہی ہے،

ان جملہ مباحث کو یکجا کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان میں قوت ارادہ و شعور کا پایا جانا
اسکو مستلزم ہے کہ انسان ایک ایسا وجود نہیں ہے جو تمام تر بیرونی اثرات یا قوتوں کا معمول ہو بلکہ وہ بذات

خود بھی ایک عامل ہستی ہے اور ہمارے مظاہر حیات کا یہی وصف (یعنی عامل بالذات ہونا) نمایاں ترین وصف ہے
اس وصف کے متعلق جب ہم علمی حیثیت سے تلاش و جستجو کرتے ہیں تو ہم کو کسی دلیل سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ
یہ اُن اثرات کے باعث پیدا ہوتا ہے، جو بیرونی دنیا میں حدوث و تغیرات کے باعث معمولاً ہو رہے ہیں بلکہ
یہ وصف انسان کا ایسا ذاتی وصف ہے، جس کا تعلق اس عالم مشہود و ظاہر سے معلوم نہیں ہوتا، رہا اس کی
حقیقت کا سوال اس کے متعلق پہلے ہی معذوری کا اظہار کیا جا چکا ہے، ہمارا موجودہ موضوع تو صرف اس حد
تک محدود تھا کہ ہم یہ بتا دیں کہ انسانی وجود کا راز خود انسان ہی کے عامل بالذات ہونے میں پنہاں ہے،
اسی عامل بالذات وصف کیلئے روح کی اصطلاح ہماری زبان میں وضع ہو چکی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اصطلاح کے بارہ میں کوئی نزاع نہیں ہو سکتی

جہاں تک "وجود روح" کی بحث تھی یہ موضوع ختم ہو چکا ہے، اب صرف یہ امر بحث طلب رہ گیا ہے
کہ آیا یہ وصف انسانی جس کو روح کہا جاتا ہے، ہماری اس ظاہر ظہور موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے یا نہیں،
بقائے روح کے متعلق تفصیلاً کسی دوسرے موقع پر بحث کیجائے گی، لیکن اس مضمون کے خاتمہ
پر اشارةً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ ظاہر ہے کہ انسانی روح کا تعلق ہمارے اس جسم مادی سے نہیں
ہے، بلکہ یہ اس کے ماوراء اور اس پر متصرف ایک ایسی چیز ہے جو خود اپنا مستقل بالذات وجود رکھتی ہے تو پھر
یہ گمان کیوں کیا جائے کہ فنائے جسم کے ساتھ یہ بھی فنا ہو جائے گی، روح ہمارے جسم سے جداگانہ نوعیت
رکھتی ہے، اس لیے یقیناً وہ ان حالات و اسباب کی تابع نہیں ہو سکتی جو ہمارے جسم یا اس عالم محسوس و
مشہود سے متعلق ہیں، "فنا یا موت" کا جو کچھ بھی ہم کو علم ہوا اور اس کو جس طرح بھی ہم جانتے پہچانتے ہیں، وہ صرف
اس جسم یا مادہ ہی کے احوال و کیفیات ہیں اسلئے یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہوگا کہ جو شے جسم و مادہ کی جنس سے نہیں
اس پر موت و حیات کا وہ قانون جاری نہیں ہو سکتا جو جسم یا جسمانیت سے متعلق ہے، اس لئے یہ خیال کہ
فنائے جسم کے ساتھ ہی فنائے روح بھی لازمی ہے، قطعاً بے دلیل اور بے بنیاد ہے، بلکہ دلائل کا رخ سمت
مخالف میں ہے، لیکن بہ صورت یہ ضرورت مسلم ہے کہ بقائے روح پر براہ راست شواہد ہونے چاہئیں جو کسی آیندہ موقع پر بیان کئے جائینگے

تاریخ خطیب بغدادی

از
نواب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی

اس دور قحط الرجال کی (جبکہ بقیہ نقبہ رجال علم بھی علمی مجلسون کو خالی کر رہے ہیں) یہ بڑی سعادت ہے کہ
وہ علمی اسلامی تصانیف جنکو زمانے کی آنکھین صدیوں سے ترس رہی تھیں، اور جن کے نام صرف کتابون مین رہ گئے
تھے، یکے بعد دیگرے شائع ہو کر دل و دماغ کو منور کر رہی ہیں، تاریخ کے سلسلے کو ملاحظہ کیجئے، مثلاً تاریخ ابن جریر
طبری عرصہ ہوا طبع ہو چکی، حافظ ابن عساکر کی تاریخ کے اجزا شائع ہوئے، حال مین تاریخ خطیب بغدادی مصر سے
آئی، طباعت کی ان خوبیون کو لیے ہوئے جنپر بیروت کے بہترین مطبعے رشک کریں، اہتمام صحت کیساتھ
ضروری تحشی بھی ہے، رجال کی فہرست دی ہے، ہر صفحے پر سطرون کا شمار ہے، اس تاریخ کی چودہ جلدین ہین، کل صفحات ۱۱۴۶ مین تعجب
ہے کہ مطبع نے ہر جلد کی لوح پر جلدون کی تعداد ۱۲ اور صفحات کی تعداد ۸۰۰۰ لکھی ہے، انتہا یہ کہ چودھوین جلد کی لوح پر بھی یہی اطلاع درج ہے
اس تاریخ کا خلاصہ بھی کیا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ میرے یہان ہے، یہ خلاصہ فلسکیپ کے ۳۸۱ صفحات پر ختم
ہوا ہے، خلاصہ نگار قاضی ابوالیمن مسعود بن محمد بخاری حنفی المتوفی سنہ ۴۹۱ھ خطیب کے شاگرد ہین، دیباچہ مین تاریخ خطیب
کی تعریف کر کے لکھتے ہین کہ "طویل زیادہ ہے، اس لئے مین نے منتخب رجال کے (بر ترتیب اصل کتاب) حالات،
شعر، حدیث، حکایت حسب سند خود مختصراً نقل کئے ہین"، واضح ہو کہ کل رجال خلاصہ کی تعداد چند صد سے متجاوز نہ
ہوگی، منتخب شعر وغیرہ مستقل عنوان ہیں،

بستان المحدثین سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ خطیب کا کوئی حصہ شاہ صاحب کے پیش نظر بھی تھا مگر مطبوعہ

نسخہ کو دیکھکر یہ تعین مشکل ہے، کہ کونسا جزء کتاب تھا، عبارت بستان کا ترجمہ یہ ہے،

"تاریخ بغداد خطیب بغدادی کی تصانیف میں سے ہے، اس کے جزء ثانی کے شروع میں مناقب بغداد اور اس مبارک بنیاد کی بزرگی اور اس کے باشندوں کے محاسن اخلاق درج کئے ہیں"،

اس کے بعد بغداد کی دونوں نہروں کا جو دجلہ اور فرات ہیں ذکر کیا ہے، بخاری کے حالات شرح وبسط کے ساتھ لکھے ہیں، محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب کے احوال تک کتاب کا ایک ربع ختم ہو جاتا ہے، پہلی اسناد اس کی یہ ہے، حافظ ابو بکر نے کہا ہے کہ ہم کو عبد العزیز ابن ابی الحسن القرمیسینی نے خبر دی، الخ،

اس کے بعد چند شعر مدح بغداد کے نقل کئے ہیں جنکا پہلا شعر ہے ؎

فدتک یا بغداد کل قبیلۃ من الارض حتی خطتی و دیاریا۔

مطبوعہ نسخہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مناقب بغداد جلد اول کے ابتدا میں ہیں، علی ہذا القیاس دجلہ وفرات کا ذکر، امام بخاری کا ذکر جلد دوم کے آغاز میں ہے، محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب کا ذکر اسی جلد کے تین ربع ختم ہونے پر شروع ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ملاحظے میں کونسی جلد تھی، بظاہر جلد اول و دوم کا مجموعہ تھا، اس صورت میں ابن ابی ذئب کے ذکر تک ربع کتاب ختم ہونے کا کیا مطلب ہوگا،

خطیب بغدادی نام احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بغدادی، کنیت ابو بکر، ۳۹۲ھ میں بمقام درزیجان پیدا ہوئے جو عراق کا ایک قریہ تھا، ان کے والد قریۂ مذکور میں خطیب تھے، اور فی الجملہ علم آشنا، باپ کی تحریک سے بیٹے نے تحصیل علم شروع کی، گیارہ برس کی عمر تھی کہ والد نے ان کو حدیث سنوانی شروع کر دی تھی، اس کے بعد خطیب نے اپنی محنت سے اقلیم در اقلیم سیاحت کر کے علم حاصل کیا، جملہ فنون حدیث میں امام وقت ہو گئے، حافظ ابو نعیم ان کے مشائخ میں ہیں، حافظ ابن ماکولا شاگرد، حافظ ابن عساکر جو مبیّن شاگردوں کے شاگرد، خطیب کا شمار کبار شافعیہ میں ہے، فقہ ابن المحاملی اور قاضی ابو الطیب سے حاصل کی، اسپر اتفاق ہے کہ دار قطنی کے بعد علوم حدیث کا ماہر ان سے بڑھکر نہیں ہوا، حفاظ کا ان پر خاتمہ ہو گیا، صاحب ہیبت باوقار اور ثقہ تھے، خط پاکیزہ تھا، کثیر الضبط فصیح البیان، آواز بلند تھی، جو روایت حدیث کے وقت جامع منصور کے آخری حصے میں سنی جاتی تھی، حتی کہ یہ کے سامنے صحیح بخاری مکہ مکرمہ میں پانچ دن میں پڑھی، عمر کا زیادہ حصہ بغداد میں صرف کیا، حاضری حرم کے وقت زمزم پی کر تین دعائیں کیں، بغداد میں اپنی تاریخ کی روایت کریں، جامع منصور میں روایت حدیث کریں، حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوں، تینوں دعائیں قبول ہوئیں،

سفر حج میں شام تک قریب غروب ایک قرآن ترتیل کے ساتھ ختم کر لیتے تھے، اس کے بعد لوگ جمع ہو کر روایت حدیث کی التجا کرتے، خطیب سواری میں بیٹھکر روایت حدیث کرتے (عرب میں سفر شب کو ہوتا ہے)

ایک بار کسی نے ان کو دیکھکر کہا تم حافظ ابو بکر خطیب ہو، فرمایا میں ابو بکر خطیب ہوں، حفظ حدیث دار قطنی پر ختم ہو گیا، چلتے چلتے کتاب کا مطالعہ کرتے جاتے، جنبلیوں کی سختی سے تکلیف اٹھائی، تصانیف کی تعداد ۵۶ ہے (تفصیل ملاحظہ ہو تذکرۂ ذہبی میں)

بہت دولتمند تھے، اہل علم اور علم کی خدمت میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں،

عقائد میں مذہب ابو الحسن اشعری کے پیرو تھے جو بقول امام سبکی محدثین کا مذہب قدیماً وحدیثاً رہا ہے،

ایک بار شیخ ابو اسحاق شیرازی کے درس میں حاضر ہوئے، شیخ نے ایک حدیث بحر بن کثیر السقاء سے روایت کی، بعد روایت خطیب کی جانب متوجہ ہو کر کہا ان کی نسبت کیا کہتے ہو، کہا اجازت ہو تو حال بیان کروں، یہ سنکر شیخ ان کے سامنے سنبھلکر شاگرد کی طرح بیٹھ گئے، خطیب نے اس شرح وبسط سے حال بیان کیا کہ اس کو سنکر شیخ ابو اسحاق نے کہا کہ خطیب اپنے وقت کے دار قطنی ہیں،

اکہتر برس کی عمر پا کر ۴۶۳ھ میں انتقال کیا، نماز جنازہ ابو الحسن ابن المہتدی نے پڑھائی، شیخ ابو اسحق شیرازی نے جنازہ کو کندھا دیا، حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوئے، رضی اللہ عنہ، وفات سے پہلے کتابیں وقف کر دیں، مال و دولت خلیفہ کی اجازت لیکر تقسیم کر دی، چونکہ کوئی وارث نہ تھا، لہذا متروکہ حق بیت المال ہوتا، اجازت یوں ضروری تھی، (ماخوذ از تذکرۃ الحفاظ ذہبی وطبقات سبکی)

تاریخ خطیب

جیسا کہ اوپر لکھا گیا تاریخ چودہ جلدوں میں ہے، مصر سے ۱۳۴۹ھ میں اشاعت شروع ہوئی، بغداد کے حالات و واقعات آغاز بناء سے ۴۶۳ھ تک لکھے ہیں، اور یہ زمانہ (جیسا کہ لوح کتاب پر بھی لکھا ہے) بغداد کی آبا[دی] کا زمانہ ہے، خطیب دیباچہ میں لکھتے ہیں "یہ کتاب مدینۃ السلام کی تاریخ ہے جس میں اس کے آبادی کا ذکر ہے، ا[س] کے کبرا، ساکنین، واردین اور علما کا تذکرہ ہے، اپنے علم و معرفت کی حد تک میں نے اس میں حالات لکھد یئے ہیں" اس عہد کے دستور کے مطابق حالات و واقعات بسلسلۂ روایت لکھے ہیں، سب سے اول بروایت یونس امام شافعی کا قول لکھا ہے، یونس سے پوچھا تم بغداد گئے ہو، نفی میں جواب سنکر فرمایا "ما رایت الدنیا" تم نے دنیا نہیں دیکھی

تاریخ خطیب جسطرح بہترین زمانے کی تاریخ ہے اسی طرح طرز بیان کے لحاظ سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معانی استعمال کئے ہیں، عبارت آرائی و مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح و تعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآرا مقامات میں قوت فیصلہ کی کمی نمایاں ہے، محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ، منطقیانہ تذبذب پاس نہیں،

روش تاریخ مروجہ طریقہ سے علحدہ ہے، بجائے خلفاء و امراء کو مستقل موضوع قرار دیکر ان کے حالات بیان کرنے کے رجال تاریخ کا ذکر بترتیب حروف تہجی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اپنے اپنے موقع سے خلفاء و امراء بھی آجاتے ہیں، رجال کے سلسلے میں ہر فن اور علم کے ماہرین مذکور ہیں، مفسرین و محدثین و فقہاء سے لیکر شعراء اور مغنیین و اہل صنعت تک سب ہی کا ذکر ہے، اس طرح ۷۸۳۱ مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے،

چونکہ یہ زمانہ مجتہدانہ قوت کا تھا اس لیے اکابرین امت سب ہی اس سلسلے میں آگئے ہیں، مگر وہ حضرات جو بعد کو ہوے ابتدائی چند بابوں میں متعلق فقہی مسائل سے محدثانہ و فقیہانہ بحث کی ہے، مثلاً زمین بغداد کی بیع و شراء اور اسکی پیداوار کا کیا حکم ہے، چونکہ حضرت عمرؓ نے سواد (عراق) کی زمین کو مسلمانوں کے حق میں وقف فرما دیا تھا اس لیے اس پر مالکانہ قبض و تصرف فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک ناجائز و مکروہ تھا، امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے تقویٰ کے متعلق کوئی مسئلہ پوچھا تو فرمایا۔ استغفر اللہ! میرے لئے ورع و تقویٰ کے مسائل پر گفتگو کرنی

درست نہیں اس لئے کہ میں بغداد کی پیداوار کھاتا ہوں، بشر بن الحارث (حافی) ہوتے تو وہ تم کو جواب دے سکتے، صلحا کو اسی لئے بغداد کی سکونت میں کلام تھا، اس مبحث پر موافق و مخالف دونوں پہلوؤں سے بسیط بحث کی ہے، فیصلہ جواز کے حق میں دیا ہے، دوسرے باب میں یہ بحث ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارض سواد فاتحین میں تقسیم کیوں نہیں فرمایا، اسی سلسلے میں عہد فاروقی کے بندوبست اراضی کا ذکر آتا ہے، جو حضرت عثمان بن حنیف صحابی نے کیا تھا اس بیان میں بندوبست شدہ اراضی کی شرح لگان، اقسام پیداوار، تعداد رقبہ سب کچھ آجاتا ہے، لگان صرف قابل زراعت اراضی پر تھا، مکانوں وغیرہ پر ٹکس نہ تھا، دوکانوں پر ٹکس مہدی خلیفہ نے لگایا ۱۶۷ھ میں،

اسی سلسلے میں ایک باب اون روایتوں پر ہے جو عراق کی برائی پر ہیں اور بعد بیان ان کی تنقیح کرکے ضعیف قرار دیا ہے، اس کے بعد مناقب عراق اور اہل عراق کی صفات کا بیان ہے، عراق کی آب و ہوا کے اعتدال کی تعریف ہے، اہل عراق کی عقل و اخلاق کی تعریف ہے، اس کے ساکنین کی خدمت حدیث کا بیان ہے، نیز بتایا ہے کہ محدثین بغداد کا دامن وضع حدیث اور کذب روایت کی شہرت سے پاک ہے، بخلاف اہل کوفہ و خراسان کے کہ ان کے احادیث موضوعہ اور اسانید مصنوعہ پر جلدیں کی جلدیں لکھی گئی ہیں، ایک قول لکھا ہے "علم حجازی اخلاق عراقی، طاعت شامی جب کسی شخص میں جمع ہوں تو وہ کامل ہے"، دوسرا قول "اذا خرجت من العراق فالدنیا کلہا رستاق" جب تم عراق سے نکل آئے تو ساری دنیا دیہات ہے، یوم جمعہ بغداد کا تذکرہ تاریخ مکہ کی عید طرسوس کی مشہور تھی،

بغداد

اس مقام کا قدیم نام بغداد تھا، بغداد کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ بغ اہل مشرق کے ایک بت کا نام تھا، واد بمعنی عطیہ یعنی بغ دیوتا کا بخشا ہوا، اسی لئے اگلے زمانے میں فقہا اس نام کا استعمال مکروہ خیال کرتے تھے، اب بغداد، بغداد تزیف ہے، یہ ہے ارباب صلاح اور اہل دل کی گرمی تاثیر، بغداد کو بغدان اور مغدان بھی کہتے تھے (کیا دان اس میں ہندی کا لفظ خیرات کے معنی میں ہے) ایک وجہ تسمیہ میں بغ کو باغ کا مخفف بھی بیان کیا ہے اور داد ایک آدمی کا نام۔ اس صورت میں نام بغداد تھا اس نام کے استعمال میں فقہا کو کراہت نہ تھی،

منصور نے جس موقع پر مدینۃ السلام آباد کیا وہاں اہل بغداد کا ایک مزرعہ تھا جسکا نام المبارکہ تھا

سائٹھ آدمی اس کے مالک تھے، منصور نے ان کو معاوضہ دیکر رضامند کیا اور اسی مقام پر نیا شہر آباد کیا، چونکہ شہر دجلہ کے کنارہ بسایا گیا اور دجلہ کا نام وادی السلام و قصر السلام تھا اس مناسبت سے شہر جدید کا نام مدینۃ السلام رکھا گیا،

خلافت بنی عباس جن اثرات کے تحت بنو امیہ کے مقابلے میں قائم و کامیاب ہوئی ان کا اقتضا یہی تھا کہ اس کا دار الخلافہ و مرکز عراق میں ہوتا، اسی لیے عبد اللہ السفاح اول خلیفہ عباسی (سنہ ۱۳۲ تا ۱۳۶ھ) نے دار الخلافہ پہلے کوفہ میں بنا کر اس کا نام ہاشمیہ رکھا، سنہ ۱۳۴ھ میں انبار کو دار الخلافہ قرار دیکر ہاشمیہ سے موسوم کیا وہیں سفاح کی وفات و تدفین ہوئی اور وہیں منصور کی بیعت، (معجم البلدان)

مدینۃ السلام کی بنیاد سنہ ۱۴۵ھ میں رکھی گئی، سنہ ۱۴۶ھ میں شاہی عمارتوں کا اس قدر حصہ تیار ہو گیا کہ منصور مع لشکر اور خزانے کے ہاشمیہ سے منتقل ہو کر وہاں آگیا، سلسلۂ تعمیر سنہ ۱۴۹ھ تک جاری رہا، سنہ مذکور میں چار دیواری تیار ہونے پر کام ختم ہو گیا، مصارف تعمیر چالیس لاکھ آٹھ سو درم ہوئے، طریقۂ تعمیر یہ تھا کہ اول تمام ممالک خلافت سے ہر قسم کے کاریگر مثلاً انجینیر (مہندس) معمار، نجار، لوہار وغیرہ فراہم کیے گئے، انکی تنخواہیں مقرر کیں، اس طرح ہزاروں آدمی جمع ہونے پر انجینیروں کو اپنا ذہنی نقشہ سمجھایا، انھوں نے اس کے مطابق داغ بیل کی، شہر کا نقشہ مدور قرار دیا گیا، اس اہتمام سے تعمیر شروع ہو کر پانچ سال میں ختم ہو گئی، عجمیت کا اثر یہ تھا کہ ساعت نوبخت منجم نے تجویز کی، یہاں تعمیر کے ضمن میں بہت سے مفید مباحث آجاتے ہیں، مثلاً معماروں وغیرہ کی شرح تنخواہ، اسکی مناسبت سے اس عہد میں اجناس کا نرخ، مدینۃ السلام کی پیمایش، اس کے دروازے مساجد۔ پل۔ مقابر۔ نہریں وغیرہ،

تعمیر کے بعد جو ترمیمیں خود منصور نے کیں ان کا ذکر ہے، بازار پہلے محلات شاہی کے زیادہ قریب تھے دور ہٹا کر آباد کیے گئے، اسطرح کرخ کی آبادی وجود میں آئی، سڑکیں چوڑی کی گئیں، سب سے زیادہ چوڑی سڑک چالیس ذراع (ہاتھ) چوڑی تھی، تقریباً، فتح کرخ کے بعد رصافہ ولیعہد مہدی کے لیے آباد کیا، یہ سنہ ۱۵۴ھ کا واقعہ

اسی طرح عہد بعہد کے اضافے بیان کیے ہیں، اسی ضمن میں عروج تکلفات کا وہ منظر سامنے آجاتا ہے جبکہ المقتدر کے عہد (سنہ ۳۰۵ھ) میں سفیر روم کی آمد میں شہر آراستہ کیا گیا تھا، تفصیل کا شوق ہے تو اصل کتاب دیکھو،

ان مقابر کے بیان میں جو علما و صلحا کے لئے مخصوص تھے جداگانہ مستقل باب ہے، سب سے اول مقابر قریش کا بیان ہے جہاں حضرت موسیٰ کاظم کا مزار تھا (یہی مقام اب کاظمین ہے) ابو علی الخلال کا قول نقل کیا ہے، ما همنی امر فقصدت قبر موسیٰ بن جعفر فتوسلت به الا سهل الله تعالیٰ لی ما احب، جب مجھکو کوئی مشکل پیش آتی اور میں موسیٰ بن جعفر کی قبر پر حاضر ہو کر ان کے توسل سے دعا کرتا تو اللہ تعالیٰ میری مراد بر لاتا،

باب حرب کے مقبرے میں امام احمد بن حنبل اور حضرت بشر حافی مدفون تھے، اسی سلسلے میں دو روایتیں ہیں، امام احمد بن حنبل کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا کہ ہر قبر پر ایک قندیل روشن ہے، پوچھا یہ کیا ہے، جواب "تم کو معلوم نہیں؟ امام احمد بن حنبل کی آمد کے سلسلے میں یہ قبریں پر نور ہوئی ہیں، جو عذاب میں تھے ان پر رحم فرمایا گیا"

خاکسار کہتا ہے کہ جوانمرد امام کا استقبال اسی شان سے ہوتا تھا رضی اللہ عنہ،

دوسری روایت حضرت بشر حافی کے وصال کے متعلق ہے، ایک راوی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے ایک پڑوسی کو بعد وفات دو حلے پہنے ہوئے دیکھا، استفسار پر کہا کہ ہماری قبرستان میں بشر بن الحارث دفن ہوئے ہیں، اس سلسلے میں تمام اہل مقبرہ کو دو دو حلے عطا ہوئے ہیں، قدس سرہ۔

حضرت معروف کرخی کی قبر باب الابر کے مقبرے میں تھی، اسکی نسبت لکھا ہے، قبر معروف مجرب بقضاء الحوائج، سو مرتبہ قل ہو اللہ پڑھکر جو دعا ان کے قبر کے قریب کیجائے مقبول ہوتی ہے،

مقبرہ خیزران میں محمد بن اسحٰق مصنف سیرۃ مدفون تھے، نیز امام اعظم ابو حنیفہؒ۔

امام اعظم کی قبر کے متعلق امام شافعی کی ایک روایت لکھی ہے، علی بن میمون (شاگرد امام شافعیؒ) روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے شافعی نے کہا، انی لاتبرک بابی حنیفة واجیٔ الی قبرہ فی کل یوم یعنی زائرا فاذا عرضت لی حاجة صلیت رکعتین وجئت الی قبرہ وسألت اللہ تعالیٰ الحاجة عندہ

فضا بتعدن عنی حتی تقضیٰ، میں ابو حنیفہ کے توسل سے برکت حاصل کرتا ہوں، ہر روز انکی قبر کی زیارت کو جاتا ہوں
جب کوئی حاجت پیش آجاتی ہے دو رکعت نماز پڑھکر ان کی قبر کے پاس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں، دعا کے بعد
مراد برآنے میں دیر نہیں لگتی،

یہ بیانات جلد اوّل کے صفحہ ۲۰۷ تک چلے جاتے ہیں، اس کے بعد مداین کا ذکر بوجہ قرب تام آتا ہے اور
مداین تقریب ہو جاتا ہے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر کی جنکے قدوم سے مداین مشرف ہوا، ان حضرات
کی تعداد پچاس ہے، اسی شرف کی وجہ سے مداین کا ذکر دیگر قصبات متصلۂ بغداد، مثلاً نہروان، انبار وغیرہ
سے پہلے کیا ہے،

سب سے اوّل ذکر ہے حضرت امیر المومنین علی کا، سب سے آخر میں عبد اللہ الحارث کا، ذکر مداین بھی ان
ہوا ہے تاریخ خطیب میں حضرات صحابہؓ کے ذکر مبارک کے آنے کا، ورنہ بغداد میں کسی صحابی کی آمد ثابت نہیں
حضرت علیؓ کے مدفن کی بحث بسیط ہے، راوی نے امام ابو جعفر محمد بن علی (امام باقر) سے پوچھا کہ حضرت علی کہاں
دفن ہوئے تو کہا بالکوفۃ لیلاً وقد غبی عنی قبرہ، کوفہ میں شب کو، اور مجھکو ان کے قبر کا حال نہیں معلوم،
ابن سعد کی روایت ہے کہ کوفے میں مسجد جامع کے قریب قصر الامارۃ میں دفن ہوئے،

عبد الملک راوی کا بیان ہے کہ میں حافظ ابو نعیم کے پاس بیٹھا تھا کہ کچھ سوار وہاں سے گذرے، میں نے
کہا یہ لوگ کہاں جاتے ہیں، کسی نے کہا علی بن ابی طالب کے مزار کو جاتے ہیں، حافظ ابو نعیم نے میری طرف متوجہ
ہو کر کہا کذبوا نقلہ ابنہ حسن الی المدینۃ، یہ لوگ کاذب ہیں ان کو ان کے بیٹے حسن نے مدینہ منتقل
کر دیا ہے، شریک کا یہ قول حدیث نبوی میں ہے، نقلہ واللہ الحسن بن علی الی المدینۃ، واللہ حسن
بن علی نے ان کو مدینہ منتقل کر دیا، اس مضمون کی اور متعدد روایتیں ہیں،

حافظ ابو نعیم سے خطیب نے روایت کی ہے کہ ابو جعفر الحضرمی اس کے منکر تھے کہ جو مصنوعی قبر کوفے کی
مسندی ہے وہ حضرت علی کی قبر ہو اور یہ بھی کہتے تھے کہ شیعوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قبر کس کی ہے تو وہ سنگسار
کر دینگے، یہ قبر مغیرہ بن شعبہؓ کی ہے، اگر یہ قبر علی کی ہوتی تو میں اسکو اپنا ملجا وماوی بنا لیتا،

حضرت امام حسین کی قبر کے متعلق لکھا ہے، احمد بن سعید الحمال سے روایت ہے، سألت ابا نعیم عن زیارۃ
قبر الحسین فکانہ انکر ان یعلم این قبرہ۔ میں نے ابو نعیم سے زیارۃ قبر حسین کی بابت دریافت کیا تو ان کے
بیان سے ایسا معلوم ہوا کہ ان کو اس کا علم نہ تھا کہ ان کی قبر کہاں ہے، صحابۂ کرام کے ذکر کے سلسلے میں پانچواں نمبر
حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذکر کا ہے، اثنائے ذکر میں لکھا ہے، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ قرآن اور شرائع و
احکام کی تعلیم کے لیے بھیجا، فبث عبد اللہ فیھم علما کثیرا وفقہ منھم جما غفیرا، کوفہ پہنچکر عبد اللہ نے کوفیوں
میں بکثرت علم پھیلایا، اور ایک گروہ کثیر ان کی تعلیم سے فقیہ بنا، خاکسار کہتا ہے کہ یہی علم فقہ حنفی کی بنیاد ہے،

حضرت ابن مسعودؓ کے اخلاق اسلامی کی وسعت کا ایک واقعہ اس زمانے میں شمع ہدایت بن سکتا ہے، علقمہ
راوی ہیں کہ میں عبد اللہ بن مسعود کے ساتھ مداین سے نکلا، راستے میں ایک مجوسی بھی ہمارے ساتھ ہو لیا، آگے چلکر
عبد اللہ بن مسعود کسی ضرورت سے ہم سے الگ ہو گئے، واپس آئے تو مجوسی دوسرے راستے پر جا چکا تھا، یہ دیکھکر
اس راستے پر جا کر اس سے ملے اور سلام کیا، اور فرمایا ان للصحبۃ حقا، رفاقت کا بڑا حق ہے، کاش اس واقعے
کو سنکر ہمارے سینے کشادہ ہو جائیں،

تراجم | صحابۂ کرام کا ذکر صفحہ ۲۱۲ پر ختم ہونے پر کتاب اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتی ہے، اور اہل بغداد کا ذکر
شروع ہوتا ہے، خطیب لکھتے ہیں، اس سلسلے میں خلفاء، اشراف، کبراء، قضاۃ، فقہا، محدثین، قراء، زہاد، صلحاء،
متادبین، شعرائے اہل مدینۃ السلام کا مذکور ہے، اہل مدینۃ السلام سے وہ مراد ہیں جو وہاں پیدا ہوئے یا دوسری
جگہ سے آکر وہاں بسے، ان کا بھی ذکر ہے جو بغداد چھوڑ کر دوسری جگہ فوت ہوئے، وہ بھی مذکور ہیں جو اس کی
نواح قریب میں ساکن تھے یا وہاں آکر رہے، ان کی کنیت، ان کا نسب، مشہور واقعات، حسب، اخبار نیک،
مدۃ عمر، تاریخ وفات، حالات بقدر اپنی معرفت وعلم کے درج کئے ہیں، اسی کیساتھ انکے متعلق ثنا و مدح و ذم و قدح،
قبول و رد اور تعدیل و جرح کے جو الفاظ محفوظ ہیں وہ نقل کر دیئے ہیں، اور حروف معجم کی ترتیب ملحوظ ہے تاکہ مطلب بآسانی حاصل ہو سکے، بعض اوقات

کسی بلند پایہ کتاب میں کوئی اہم مضمون نظر سے گذرا دوسرے وقت تلاش کیا، بہت وقت صرف کیا، نہ ملا
چھوڑ دیا، حالانکہ ضرورت و حاجت باقی رہی، اسی لئے حروف تہجی کی ترتیب اختیار کی،

نام مبارک سے برکت حاصل کرنے کے لحاظ سے اول ان صاحبوں کا ذکر ہے جنکا نام محمد تھا، اس کے
بعد حروف تہجی کی پابندی کی ہے، اسی ضمن میں حافظ تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ طالب حدیث پر لازم ہے کہ
اول اپنے شہر کی کتب حدیث اور ان کے مولفین کے حال سے آغاز کرے، ان کی فہم میں ملکۂ تامہ بہم پہنچا
جس سے صحیح و سقیم وغیرہ کی معرفت تامہ حاصل ہو، اس کے بعد دوسرے شہروں کو لے۔

رجال تذکرہ کے حالات کے ضمن میں بڑے بڑے علمی دقائق و مباحث مجتہدانہ و محدثانہ قوت کیسا
حل ہوتے جاتے ہیں، جن سے علما استفادہ کر سکتے ہیں، کاش اہل مطبع مطالب کی فہرست بھی مرتب کر سکتے
جس طرح یورپ میں ہوتا ہے،

اسم مبارک سے مسمی مشاہیر کے ۹۰۵ تذکرے تین جلدوں میں آئے ہیں، چوتھی جلد احمد نامی مشاہیر سے شروع
ہم چند تذکروں کا خلاصہ لکھکر اس عہد کے علماء کا پایۂ بلند دکھانا چاہتے ہیں، خصوصاً یہ کہ یونانیت سے اذہان کے متاثر
ہو جانے سے قبل ہمارے علم و علما کی کیا شان تھی،

سب سے اول ذکر محمد بن اسحق سیرۃ نگار کا ہے، اور یہ (بقول مولف) اس وجہ سے کہ ان سے زیادہ کوئی ا
اکبر سن، اعلی اسناد، اقدم موت نہ تھا، ورنہ حروف تہجی کے رعایت کے اعتبار سے محمد بن احمد کا ترجمہ پہلے آتا، واضح ر
محمد بن اسحق صاحب سیرۃ کے تذکرے کی مناسبت سے تمام وہ مشاہیر جن کے باپ کا نام اسحق تھا، اسی سلسلے میں آگئے
ہیں، اس طرح یہ سلسلہ ۱۵ سے شروع ہو کر ۹۶ پر ختم ہوتا ہے، ۹۷ نمبر سے محمد بن احمد کا آغاز ہے، آمدم بر سر مطلب،

محمد بن اسحق صاحب سیرۃ محمد بن اسحق صاحب سیرۃ کی کنیت بقول قوی ابوبکر ہے، ابوعبداللہ قول ضعیف ہے، صحابۂ
کرام میں حضرت انس بن مالک کو دیکھا، اکابر تابعین سے روایت کی ہے، مثلاً حضرت نافع زہری، قاسم بن محمد
امام محمد باقر، ائمۂ علما نے ان سے روایت کی ہے مثلاً یحیی بن سعید سفیان ثوری، شعبہ، حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ وغیرہ

بغداد آکر مقیم ہوے، وہیں مقبرۃ الخیزران میں مدفون ہوئے، بعض کے نزدیک فارسی الاصل ہیں، بعض کی روایت
میں عربی، موسی بن جسار حضرت ابوہریرہؓ کے راوی ان کے چچا تھے، ان کی جرح تعدیل کے متعلق طویل بحث ہے
ان کے ثقہ اور صادق ہونے پر اکابر کا اتفاق نقل کیا ہے،

اسی سلسلے میں امام مالکؒ کی جرح کے مالہ وما علیہ سے محققانہ بسیط بحث کی ہے، کہ محققین کے نزدیک امام
مالک کی جرح کا کیا پایہ ہے، تالیف سیرۃ کی وجہ ایک روایت سے یہ بیان کی ہے کہ ابن اسحق ایک روز خلیفہ مہدی
کے یہاں گئے، اس وقت خلیفہ کے پاس ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، مہدی نے پوچھا جانتے ہو یہ کون ہے، کہا امیر المومنین
کے فرزند ہیں، خلیفہ نے کہا تو ان کے واسطے ایک تاریخ لکھو جس میں آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک کی تاریخ ہو، چنانچہ
ابن اسحاق نے سیرۃ لکھی، مہدی نے دیکھکر کہا طویل بہت ہو گئی، مختصر کر دو، چنانچہ مختصر کر دی گئی، آج جو ان کی کتاب موجود
ہے، وہ یہی مختصر ہے، پہلا طویل مسودہ امیر المومنین کے خزانے میں رہا،

یہ روایت بیان کر کے خطیب نے تصحیح کی ہے کہ بلحاظ واقعات یہ روایت صحیح نہیں، ابن اسحق خلیفہ منصور کے
پاس گئے ہونگے، اور اُن کے پاس مہدی ان کا فرزند ہوگا، مہدی کی خلافت کا آغاز ۱۵۸ھ میں ہوا، ابن اسحاق
کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی، بعض نے ابن اسحاق کا سن وفات ۱۵۱ھ اور ۱۵۲ھ بھی بیان کیا ہے،

محمد بن ابراہیم ابوحمزۃ الصوفی محمدؒ بن ابراہیم ابوحمزۃ الصوفی، احمد بن حنبل، بشر بن الحارث (الحافی) سری سقطی کے صحبت
یافتہ ہیں، علم قرأت کے عالم تھے، خصوصاً قرآت ابوعمرو کے،

امام احمد بن حنبل صوفی کہکر ان کو مخاطب فرماتے تھے، ماتقول فیہا یا صوفی، سب سے اول اسرار
تصوف انھوں نے بیان کئے، چنانچہ خطیب نے روایت کی ہے کہ بغداد میں جس نے سب سے اول صفا، ذکر، جمع ہمت
محبت، شوق، قرب، انس پر کلام کیا ہے وہ ابوحمزہ ہیں، ان سے پہلے کسی نے علی رؤس الاشہاد یہ مسائل بیان نہیں
کئے، ۲۶۹ھ میں وفات پائی،

امام بخاری امام بخاریؒ کے حالات میں تیس صفحے لکھے ہیں، جنمیں حالات کی پوری تفصیل ہے، خلق قرآن کے مسائلے

پر بھی مفصل بحث ہے جس کی وجہ سے امام بخاری کو آخر عمر میں دشواری پیش آئی،

حلیہ ضعیف الجثہ، قد او سط نہ طویل نہ قصیر، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، عید الفطر
کی شب میں ۲۵۶ھ میں وفات پائی، نماز ظہر کے بعد مدفون ہوئے، کسی نے پوچھا کہ طلب حدیث کس طرح شروع کی
فرمایا، دس برس کی عمر میں مجھکو الہام ہوا کہ حفظ حدیث کروں، اس وقت میں مکتبوں میں کام سیکھتا تھا، اسکو چھوڑ کر
میں تحصیل علم حدیث میں مشغول ہوگیا، الداخلی وغیرہ کے یہاں جانا شروع کیا، ایک روز الداخلی نے کہا سفیان عن
ابی الزبیر عن ابراہیم، میں نے کہا ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی، انھوں نے جھڑک دیا، میں نے کہا اصل
تمھارے پاس ہے تو دیکھ لو، چنانچہ وہ گھر میں گئے، اصل کتاب دیکھ کر باہر آئے، مجھ سے پوچھا روایت کس طرح
ہے، میں نے کہا، "الزبیر بن عدی عن ابراہیم، یہ سنکر قلم میرے ہاتھ سے لیا اور اپنا نسخہ صحیح کر کے کہا تمھارا بیان صحیح
ہے، کسی نے پوچھا اس وقت کیا عمر تھی، فرمایا گیارہ سال کی، سولہ برس کی عمر میں ابن مبارک، وکیع کی کتابیں
حفظ کر کے سمجھنے لگے تھے، اسی سال اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے، حج کے بعد بھائی واپس گئے
خود تحصیل حدیث کے واسطے وہاں رہ گئے، اٹھارہ برس کی عمر میں قضایا صحابہ و تابعین اوران کے اقاویل
کی تصنیف شروع کر دی، اسی زمانے میں چاندنی راتوں میں التاریخ کی تصنیف قبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس بیٹھکر کی، ان کا قول ہے کہ تاریخ میں جتنے نام آئے ہیں سب کے متعلق کوئی نہ کوئی قصہ مجھ کو معلوم تھا مگر
میں نے زیادہ طوالت پسند نہیں کی، فرمایا ہے میں نے تاریخ تین مرتبہ تصنیف کی ہے، تاریخ کی تصنیف کے بعد اسکا
نسخہ اسحٰق بن راہویہ امیر عبد اللہ بن طاہر کے پاس لے گئے، اور کہا کیا سحر میں تم کو نہ دکھلاؤں، عبد اللہ بن طاہر دیکھکر
متعجب رہ گیا،

جامع صحیح بخاری کی تالیف کی بابتہ ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اسحٰق بن راہویہ کے پاس تھا، بعض دوستوں
نے کہا کاش تم سنن النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک مختصر لکھتے، میرے دل میں یہ خیال جم گیا، اور میں نے جامع صحیح
کا جمع کرنا شروع کر دیا، جامع میں صرف صحیح حدیث لکھی ہے، بہت سی حدیثیں طویل الحال ہونے کی وجہ سے چھوڑ

بھی دی ہیں، ہر حدیث غسل کر کے لکھی ہے، تراجم کتاب ما بین المنبر والقبر دو رکعت نماز پڑھکر لکھے ہیں، فربری کا قول ہے کہ
جامع صحیح کی روایت بخاری سے نوّے ہزار آدمیوں نے کی اب ان میں سے صرف میں باقی ہوں، رمضان المبارک
میں دن میں افطار تک ایک بار کلام مجید ختم کر لیتے تھے، فرماتے تھے ہر ختم کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، مسجد میں
کسی نے امام بخاری کی داڑھی میں سے تنکا نکال کر وہیں ڈالدیا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ امام نے
لوگوں کی نگاہ بچنے پر ہاتھ بڑھا کر اس کو اٹھالیا اور آستین میں رکھ لیا، مسجد سے باہر گئے تو اس کو لیجا کر باہر ڈالدیا
آج بہت سے بخاری خواں اس واقعے سے ادب آموز ہو سکتے ہیں،

ایام طالب علمی میں چند روز درس میں حاضر نہ ہوئے ساتھیوں نے تلاش کی تو معلوم ہوا کہ لباس
پھٹ گیا، عریانی کی وجہ سے خانہ نشین ہیں، رفقا نے لباس کا اہتمام کیا تو شامل درس ہوئے، ایک ساتھی کا بیان
ہے کہ میں ایام سفر میں راتوں کو امام بخاری کو دیکھتا تھا کہ شب میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھتے، چقماق سے آگ نکالکر
بتی روشن کرتے، حدیثوں پر نشان بناتے، پھر لیٹ جاتے، امام کا قول تھا کہ میرے نزدیک حامد اور ذام (مدح
کرنے والا اور مذمت کرنے والا) یکساں ہے،

کئی صفحوں پر امام کے فضائل اور اکابر کی رائیں اُن کے حق میں پھیلی ہوئی ہیں، امام مسلم بن حجاج ان کے
سامنے اس طرح بیٹھتے جیسے لڑکا استاد کے سامنے، ایک موقع پر انھوں نے کہا تم سے بغض سوائے حاسد کے
کوئی نہیں کر سکتا، تمہارا مثل دنیا میں نہیں، ابو مصعب المدنی کا قول ہے کہ امام بخاری ابن حنبل سے حدیث و فقہ
میں بڑھے ہوئے ہیں، کسی نے سنکر کہا آپنے حد سے تجاوز کیا، کہا اگر تم نے امام مالک کو دیکھا ہوتا تو تم ان کا اور
بخاری کا چہرہ دیکھکر بول اٹھتے کہ یہ دونوں حدیث و فقہ میں برابر ہیں، امام بخاری کا ایک قول تھا کہ مجھکو ایک
لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حفظ یاد ہیں،

وفات کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ابن آدم طواویسی نے روایت کی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر مع صحابہ کے قیام فرما ہیں، میں نے سلام کیا، جواب سے مشرف ہوا، عرض

کی یہاں قیام کیوں ہے، فرمایا محمد بن اسمٰعیل البخاری کے انتظار میں کھڑا ہوں، ان کا بیان ہے کہ چند روز کے بعد امام بخاری کی وفات کی خبر پہنچی، حساب لگایا گیا تو وہی شب تھی جس شب کو خواب میں حضرت سرور عالم کو میں کھڑا دیکھا تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

امام محمد

محمد بن الحسن بن الفرقد ابو عبد اللہ الشیبانی، صاحب امام ابوحنیفہ و امام اہل الرائے، دراصل دمشقی حرستا نامی قریہ کے باشندے، ان کے والد عراق آئے، محمد واسط میں پیدا ہوئے، کوفہ میں نشو و نما پائی، امام ابوحنیفہ، مسعر بن کدام، سفیان ثوری وغیرہ سے علم سنا، سماع حدیث بکثرت کیا، نیز امام مالک، اوزاعی اور امام ابی یوسف قاضی سے، بغداد میں سکونت اختیار کی اور حدیث و فقہ کی روایت کی، امام شافعی، جوزجانی نے ان سے حدیث روایت کی ہے، ہارون رشید نے قاضی مقرر کیا، ان کے ساتھ خراسان گئے، بمقام رے انتقال کیا، وہیں مدفون ہیں، اسی روز کسائی نے وفات پائی، ہارون رشید نے کہا میں نے آج لغۃ اور فقہ کو دفن کر دیا، پیدائش ۱۳۲ھ میں وفات ۱۸۹ھ میں عمر ۵۸ سال، اگرچہ حدیث کی سماعت کثیر تھی مگر رائے پہ غور کیا، اسی کا غلبہ ہوا، اور اسی میں شہرت پائی،

ان کا قول ہے کہ باپ نے تیس ہزار روپے چھوڑے تھے، میں نے پندرہ ہزار نحو اور شعر کی تحصیل میں اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تحصیل میں خرچ کر دیئے،

امام شافعی نے امام محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں تین برس سے زیادہ امام مالک کے پاس رہا اور سات سو سے زیادہ ان سے حدیثیں سنیں، امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ جب محمد بن حسن مالک سے روایت حدیث کرتے تھے تو کثرتِ سامعین سے گھر بھر جاتا، گنجایش نہ رہتی، ایک موقع پر خلیفہ ہارون رشید کی آمد پر سب لوگ کھڑے ہو گئے، محمد بن حسن بیٹھے رہے، تھوڑی دیر کے بعد خلیفہ کے نقیب نے محمد بن حسن کو بلایا، ان کے شاگرد و احباب پریشان ہوئے، یہ خلیفہ کے سامنے پہنچے تو پوچھا کہ تم فلان موقع پر کھڑے کیوں نہیں ہوئے، کہا کہ جس طبقے میں خلیفہ نے مجھکو قائم کیا ہے اس سے نکلنا میں نے پسند نہیں کیا، اہل علم کے طبقے سے نکلکر اہل خدمت کے

طبقے میں آجانا پسند نہیں آیا، آپ کے ابن عم (یعنی آنحضرت صلعم) نے ارشاد فرمایا ہے، جو شخص اس بات کو محبوب رکھتا ہو کہ آدمی اس کے لیے کھڑے رہیں، وہ اپنا مقام جہنم میں بنائے، آپ کی مراد اس سے گروہ علما ہے، پس جو لوگ حقِ خدمت اور اعزاز شاہی خیال کر کے کھڑے ہوں تو یہ دشمن کے لیے ہیبت کا سامان ہوگا، اور جو بیٹھے رہے انھوں نے اتباعِ سنت کیا جو آپ کے خاندان سے لی گئی ہے، اور آپ کے لئے زینت ہے، ہارون رشید نے کہا سچ کہتے ہو، (ابن ابی ذئب کے بیان میں اس سے زیادہ شاندار واقعہ پڑھو گے)

بیس برس کی عمر میں مسجد کوفے میں علم کی تعلیم شروع کر دی تھی، یحیی بن صالح کا قول ہے کہ مجھے ابن اکثم نے پوچھا تم نے مالک کو دیکھا ہے، ان سے حدیث سنی ہے، محمد بن حسن کی صحبت میں رہے ہو، کون زیادہ فقیہ تھا، میں نے کہا محمد بن حسن مالک سے افقہ ہیں، ابو عبید کا قول ہے کہ کتاب اللہ کا جاننے والا محمد بن حسن سے زیادہ کوئی نہ تھا، ربیع بن سلیمان نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر میں یہ کہنا چاہوں کہ قرآن محمد بن حسن کی لغت میں اترا ہے، تو محمد کی فصاحت کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں، مزنی نے یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے کوئی موٹا آدمی محمد سے زیادہ سبک روح نہیں دیکھا، ان سے زیادہ فصیح بھی نہیں دیکھا، جب میں ان کو قرآن پڑھتے دیکھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن انہی کی لغت میں نازل ہوا ہے، ربیع بن سلیمان نے امام شافعی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ میں نے محمد بن حسن سے زیادہ عاقل آدمی نہیں دیکھا، یحیی بن معین کا قول ہے کہ جامع صغیر میں نے محمد بن حسن سے حاصل کر کے لکھی ہے، ربیع کا قول ہے کہ امام شافعی کا مقولہ تھا کہ میں نے محمد بن حسن سے ایک شتر بار کتابیں سیکھی ہیں، مزنی سے کسی نے پوچھا کہ ابوحنیفہ کے حق میں کیا کہتے ہو، کہا، سیدہم، ان کے سردار ہیں، کہا اور ابو یوسف، کہا، اتبعہم للحدیث، ان میں حدیث کے سب سے زیادہ تابع۔ کہا، محمد بن حسن کہا، اکثرھم تفریعًا، سب سے زیادہ مسائل نکالنے والے، کہا زفر کہا، احدہم قیاسًا، قیاس میں سب سے زیادہ بہتر،

امام شافعی کا یہ بھی قول ہے کہ فقہ کے معاملے میں سب سے زیادہ احسان مجھ پر محمد بن حسن کا ہے۔ محمد بن حسن

کا اپنے متعلقین کو یہ حکم تھا کہ مجھ سے دنیاوی کوئی فرمایش نہ کرو، جو ضرورت ہو میرے مختار سے لو، تاکہ میرا قلب فارغ البال رہے اور میں بے فکر رہوں،

ابن داؤد کا قول ہے کہ بصرہ والوں کا فخر چار کتابیں ہیں، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین، نیز کتاب الحیوان، سیبویہ کی الکتاب، خلیل کی کتاب فی العین (دانکھ پر) ہمارا فخر ستائیس ہزار مسائل پر ہے، جو حلال و حرام کے متعلق ایک کوفی محمد بن حسن کے نتیجۂ عمل ہیں وہ ایسے قیاسی و عقلی ہیں کہ کسی انسان کو ان کا نہ جاننا روا نہیں،

ابراہیم الحربی کا قول ہے کہ میں نے احمد بن حنبل سے سوال کیا کہ یہ مسائلِ دقیق تم کو کہاں سے حاصل ہوئے کہا محمد بن حسن کی کتابوں سے،

قاضی ابن رجا نے محمویہ سے (جو ابدال میں شمار ہوتے تھے) روایت کی ہے کہ میں نے بعد وفات محمد بن حسن کو خواب میں دیکھا، پوچھا ابا عبداللہ کیا گذری، کہا مجھے ارشاد ہوا، میں تمکو علم کا خزانہ نہ بناتا، اگر تم کو عذاب دینے کا ارادہ رکھتا، میں نے کہا ابو یوسف کا کیا حال ہے، کہا فوق، مجھ سے بالاتر ہیں، میں نے پوچھا ابو حنیفہ کہا فوق بطبقات، ابو یوسف سے بہت سے طبقے اوپر،

خطیب نے امام محمد بن حسن کی بابتہ جرح بھی نقل کی ہے، جنمیں بعض سخت ہیں، مگر اس قریباً ڈیڑھ ہزار برس کے زمانے میں، اکابر امت نے جو فیصلہ امام محمد کی عظمت کی بابتہ کیا ہے ظاہر ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی جرح قائم نہیں رہ سکتی، خطیب کا قول ہے کہ جو قول آخر میں نقل کردں وہ میری رائے ہے، (تذکرۃ الحفاظ) چنانچہ محمویہ کا خواب جو سب سے اخیر میں نقل کیا ہے، اس سے جرح و تعدیل کا فیصلہ خطیب کی تنقید کے مطابق بھی ہو جاتا ہے،

محمد بن جریر الطبری صاحب التفسیر والتاریخ

ولادت ۲۲۵ھ، وفات ۳۱۰ھ، عمر ۸۵ سال، عراق و شام اور مصر کی خلق کثیر سے علم حاصل کیا، بغداد میں آکر بسے اور وفات تک وہیں رہے، ان ائمہ علما میں سے تھے جن کے قول پر فتویٰ دیا جاتا تھا، اور ان کی معرفت و فضل کی وجہ سے ان کی رائے مانی جاتی تھی، اتنے علوم کے جامع تھے کہ ان کے زمانے میں ان کی نظیر نہ تھی، کتاب اللہ کے حافظ تھے، قرأتوں کے ماہر، معانی قرآنی میں صاحب بصیرت، احکام قرآن کے فقیہ، سنت اور اس کے طرق کے عالم، نیز اس کے صحیح و سقیم و ناسخ و منسوخ کے، صحابہ و تابعین اور انکے بعد علما کے اختلافی احکام و مسائل حلال و حرام کے عارف، تاریخ انسانی کے عارف، تاریخ الملوک والامم میں ان کی تاریخ مشہور ہے، ایک کتاب تفسیر میں ہے جس کے مثل کسی نے تصنیف نہیں کی، ایک کتاب کا نام تہذیب الآثار رکھا تھا اپنی نوعیت میں وہ بھی بے مثل تھی مگر تمام نہیں ہوئی، اصول فقہ و فروع میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بہت سے مسائل فقہ میں متفرد ہیں جو محفوظ ہیں، اقوال فقہا میں اپنی رائے سے ترجیح بھی دی ہے، سمعانی کی روایت ہے کہ ابن جریر نے چالیس برس تک روزانہ چالیس ورق لکھے ہیں (کل تعداد اوراق ۵۷۶۰۰۰ ہوتی ہے، شروانی)

فقیہ ابو طاہر اسفرائینی کا قول تھا کہ اگر کوئی شخص چین تک تفسیر ابن جریر کے لیے سفر کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ سفر نہیں کیا،

یہ بھی روایت ہے کہ ابن جریر طبری نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ آیا تم تفسیر قرآن سے خوش ہوگے، پوچھا کس قدر ہوگی، کہا تیس ہزار ورق، شاگردوں نے کہا ختم ہونے سے پہلے عمریں ختم ہو جائنگی، یہ سنکر تین ہزار ورق میں مختصر تصنیف کی، اس کے بعد پوچھا تاریخ عالم سے خوش ہوگے، جو آدم کے زمانے سے لیکر آج تک ہوگی، باقی سوال و جواب مثل تفسیر کے ہوے، جب تیس ہزار ورق کو شاگردوں نے زیادہ بتایا تو کہا انا للہ ماتت الھمم، انا للہ ہمتیں فنا ہوگئیں،

ابن بالویہ کا بیان ہے کہ تفسیر کا املا ابن جریر نے کیا، میں کاتب تھا، ۲۸۳ھ سے لیکر ۲۹۰ھ تک آٹھ سال میں لکھی، ابوبکر بن خزیمہ نے یہ سنکر تفسیر مجھ سے مستعار لی اور کئی برس کے بعد واپس کی اور کہا کہ اول سے لیکر آخر تک میں نے پڑھی، روے زمین پر محمد بن جریر سے بڑھکر عالم نہیں ہے،

حنبلیوں نے ان پر مظالم کئے، کسی کو ان کے پاس جانے نہیں دیتے تھے، جو جانا چاہتا تھا اسکو روک دیتے، اسی کی وجہ سے حسین تمیمی ان سے حدیث نہ سن سکے، کلام مجید اس خوبی سے پڑھتے تھے، کہ ابن مجاہد کا قول ہے، ما ظننت ان اللہ تعالیٰ خلق بشرا یحسن یقرأ ھذہ القرأۃ، میرا گمان نہیں کہ خدا تعالیٰ نے کوئی انسان پیدا

گیا ہو جو کلام اللہ کی اس قرات کو اسی خوبی و حسن سے پڑھتا ہو، بعد وفات اپنے مکان میں دفن ہوئے، انکی وفات کی بابت اذان کسی کو نہیں کیا گیا، تاہم اسقدر مخلوق جمع ہوگئی کہ ان کے شمار اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، مہینوں شب و روز انکی قبر پر نماز جنازہ پڑھی گئی،

حلیہ | رنگ پختہ، آنکھیں بڑی بڑی، نحیف الجسم، بلند و بالا، خوش بیان، باوجود پچاسی برس کی عمر کے سر اور داڑھی کے بال کثرت سے سیاہ تھے، اس سے قوت مزاج کا اندازہ کرو، رضی اللہ عنہ،

للہ در الطبری

اذا اعسرت لم اعلم رفیقی	واستغنی فیستغنی صدیقی
حیائی حافظ لی ماء وجہی	ورفقی فی مطالبتی رفیقی
ولو انی سمحت ببذل وجہی	لکنت الی الغنی سہل الطریقی

محمد بن عبدالرحمن بن المغیرۃ بن الحارث بن ابی ذئب مدنیؒ | پیدائش ۸۰ھ، ابو الحارث القرشی المدنی، عکرمہ مولی بن عباسؓ نافع مولی بن عمرؓ، ابن شہاب الزہری وغیرہم سے حدیث سنی، سفیان ثوری، وکیع، عبداللہ بن مبارک، یحیٰی بن سعید القطان اور ان کے سوا ایک جماعت نے اُنسے حدیث روایت کی ہے، فقیہ صالح متقی تھے، آمر بالمعروف ناہی بالمنکر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جرأت میں ان کی مثال سعید بن المسیب سے دیجاتی ہے، یہی قول امام احمد بن حنبل کا ہے،

امیر المومنین مہدی نے ان کو بغداد بلایا، وہاں روایت حدیث کی، امام شافعی کا قول تھا کہ مجھ کو دو صاحبوں کے نہ ملنے کا افسوس ہے، لیث اور ابن ابی ذئب، امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ابن ابی ذئب ثقہ، صدوق ہیں، مالک بن انس سے افضل تھے، مگر مالک تنقیہ رجال میں زیادہ شدید تھے، ابن ابی ذئب کو اس کی پروا نہیں کہ کس سے روایت کرتے ہیں، ان کا مثل ان کے بعد نہ ان کے بلاد (حجاز) میں تھا اور نہ دیگر بلاد میں، ابن خلاد کا بیان ہے کہ خلیفہ مہدی کا سفر حج کے دوران

میں مسجد نبوی میں ورود ہوا، خلیفہ کے داخل مسجد ہوتے ہی تمام حاضرین کھڑے ہو گئے، صرف ابن ابی ذئب بیٹھے رہے، مسیب ابن زبیر نے کہا، کھڑے ہو جاؤ یہ امیر المومنین ہیں، ابن ابی ذئب نے جواب دیا، انما یقوم الناس لرب العالمین، آدمی صرف پروردگار عالم کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، خلیفہ اس جواب کی جلالت سے کانپ گیا، ابن زبیر سے کہا ان کو چھیڑو میرے سر کے تمام بال کھڑے ہو گئے،

ابو نعیم کی روایت ہے کہ جس سال منصور نے حج کیا، میں نے بھی اسی سال حج کیا، میری عمر اس وقت اکیس برس کی تھی، ابن ابی ذئب اور مالک بن انس خلیفہ کے ساتھ تھے، غروب کے قریب خلیفہ نے ابن ابی ذئب کو بلا کر اپنے پاس دار الندوہ پر بٹھا کر پوچھا کہ تمہارا خیال حسن بن زید کی نسبت کیا ہے، جواب دیا، انہ لیتحری العدل، وہ انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ سنکر منصور نے دو یا تین مرتبہ پوچھا، میری نسبت کیا کہتے ہو، ابن ابی ذئب نے فرمایا، ورب ھذہ البنیۃ انک لجائر، قسم ہے اس عمارت (کعبہ) کے رب کی تمہارے ظالم ہونے میں شک نہیں، ربیع حاجب نے یہ سنکر ان کی داڑھی پکڑ لی، منصور نے بگڑ کر کہا، اے گندی عورت کے بیٹے چھوڑ دے، اس کے بعد تین سو اشرفی انعام کا حکم دیا،

ابن ابی ذئب نے ایک بار منصور سے کہا،

امیر المومنین تمہاری رعایا تباہ ہو چکی، کاش تم ان کی مدد مال غنیمت سے کرتے،

منصور، تم پر تباہی! اگر میں سرحدوں کی حفاظت نہ کرتا اور لشکر نہ بھیجتا تو تمہارے گھر میں خوب گوشت پکتا،

ابن ابی ذئب، تم سے جو بہتر تھے انھوں نے سرحدوں کی حفاظت، لشکروں کا سرانجام فتوح تم سے زیادہ کیں، اور اسی کے ساتھ آدمیوں کو مالا مال کیا،

منصور۔ تم پر تباہی، وہ کون تھے؟۔

ابن ابی ذئب ۔ عمر بن خطاب،

یہ سنکر منصور نے سر جھکا لیا، المسیب کے ہاتھ میں تلوار تھی، ابن ہثیم کے ہاتھ میں چوب، منصور اُس
طرف تو متوجہ نہ ہوا، محمد بن ابراہیم امام کیطرف دیکھکر کہا، ھذا اخیر اھل الحجاز، یہ تمام اہل حجاز میں

ابن ابی ذئب تمام شب خضوع وخشوع کے ساتھ عبادت میں مصروف رہتے، اگر ان سے یہ کہا
کہ کل قیامت قائم ہو جائے گی تو ان کو کچھ کرنا نہ تھا، ایک روز روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے
ایک مرتبہ شام میں زلزلہ آیا، ایک شامی نے ان سے زلزلے کی بابتہ پوچھا، انھوں نے متوجہ ہو کر حدیث
بیان کی، وہ سنتا رہا، جب ختم کر چکے تو کسی نے کہا کھانا کھا لیجئے، (وہ دن افطار کا تھا) کہا آج ملتوی رکھو
اس کے بعد مرتے دم تک تمام عمر روزے رکھے افطار نہیں کیا، تنگ دست تھے، روٹی اور تیل غذا تھی
ایک قمیص تھی ایک طیلسان، اسی میں گرما و سرما کے موسم بسر ہوتے، وکان من رجال الناس
صراحۃ وقولاً بالحق، بیباکی اور حق گوئی میں جوانمردوں میں سے تھے حدیث کی سماعت بڑی عمر
میں شروع کی، جن شیوخ سے اس تاخیر کی وجہ سے نہ مل سکے، ان کے نہ ملنے کا افسوس رہا،

تمام حدیثیں حفظ تھیں کسی کتاب میں لکھی ہوئی نہ تھیں،

امام احمد بن حنبل نے ان کو حدیث میں ثقہ، اور دینداری، تقوی اور حق گوئی میں امام مالک سے افضل کہا ہے
بھی فرمایا ہے کہ ابن ابی ذئب منصور کے پاس گئے حق کہنے میں ذرا بھی نہ ڈرے صاف کہدیا الظلم فاش ببابک، تمہارے دروازہ پر ظلم پھیلا ہوا
فشاہ میں وفات پائی، ۷۰ برس کی عمر تھی جعفر بن سلیمان نے پہلی مرتبہ والی مدینہ ہونے پر انکو سو دینار دیئے تھے
میں سے دس دینار کو ایک کروی جبہ خریدا ساری عمر وہی پہنا، انکے بعد ان کے بیٹے نے تیس برس پہنا،
خاکسار کہتا ہے کہ اس فقیرانہ گدڑی میں سے حق کے شعلے نکلتے تھے، خوش خوراکی وخوش لباسی کے دلدادہ وہ شعلے کہاں
سے پیدا کریں گے۔

(باقی)

خسرو باغ کے مقبرے

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف حیات جلیل الٰہ آباد،

(۲)

مقبرۂ خسرو

مقبرۂ خسرو ایک کنارے پر واقع ہے، اوس کے بعد کوئی مقبرہ نہیں نہ اور کوئی چیز، باغ کے صدر (جنوبی) دروازے
وہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی مستقل راستہ بھی نہیں بنایا گیا، آپ کیاریوں کے کنارے کنارے یا روشوں پر ہوکر نکل جائیے، ذرا و راست
بروا گرچہ دور است، پر عمل فرماتے ہوں، تو پھاٹک سے سیدھے سڑک پر ہو کر شاہ بیگم کے روضے تک (۱۰۰ قدم) تشریف لے جائیں
اور وہاں سے مقبروں اور حوضوں کو دیکھتے ہوئے، خسرو کی قبر تک، یہ بھی کچھ دور نہیں، مقبروں کے باہم درمیانی فاصلہ شرقاً غرباً تیس
تیس قدم ہوگا، سیر و تفریح کا شایق، یا آثار قدیمہ کا دلدادہ چار سو قدم آسانی وخوشی سے طے کر لیتا ہے،

مقبرہ ایک مرتفع پختہ (خشتی) چبوترہ پر بنا ہے جسکی بلندی ڈھائی فٹ (خسرو باغ کے باقی مقبروں سے ایک فٹ زائد) ہے
پڑھنے کے لئے پتھر کی تین سیڑھیاں موجود ہیں، چبوترہ مربع اور خوب وسیع و فراخ ہے، ہر ضلع انچاس گز، اس چبوترہ پر پھر ایک
اور چبوترہ بلند اور سنگین نقشدار (پتھروں کا) واقع ہے، یہ بھی چوکور ہے، ہر پہلو چھبیس گز، بلندی ایک گز کے قریب، مقبرہ کی
عالیشان تعمیر اسی پر ہوئی ہے، سب ملا کر کرسی کی بلندی پونے دو گز سے بھی زیادہ ہوگی، بحد حسب دستور عام خام اور سطح زمین
پر تہخانہ میں ہے، مقبرہ کے فرش بالائی سے اس کے اندر پہنچنے کے لئے کبھی راستہ رکھا گیا تھا، اب مسدود ہے، قفس زندگی کے ہم
جیسے زندانیوں کی رسائی وہاں تک دشوار ہے، اس لئے اوس کی صورت کشی یا موجودہ حالت کے بتانے سے معذور دیکھ رہوں،

عمارت مقبرہ ایک منزل کی ہے، مگر دور سے دو منزلہ معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ درون اور محرابون کی قطارین جیسی اوپر ہین، ویسی ہی نیچے بھی ہین، فرق یہ ہے کہ اوپر والے دروازے اور بند دراستے اونچے نہین ہین، جتنے کہ نیچے والے ہین، اگر دونون قطارین ایک ہی بنیاد پر قائم ہین، ہر ضلع یا پہلو مین پانچ پانچ دروازے (ہر سمت) ہین، بلند سادہ وضع کی محرابین ہین، درون کی چوڑائی چھ چھ فٹ ہوگی، کنارون کے دو دو دروازون مین زینہ ہے، دوسرا اور چوتھا ہر طرف کا بند ہے، طریق تعمیر اور محرابین اور نشانات سب کے یکسان ہین، محرابون کے اندر دیوار مین طاق ہین، ان کے پتھرون پر خط نستعلیق مین، ابھرے ہوئے حروف مین اللہ اللہ کندہ ہے، اسی طرح زیر و بالا محرابون پر نقطۂ تماس کے دونون جانب کلمہ طیبہ خوبصورت دائرون کے اندر کھدا ہے، گنبد مقبرہ کے چارون سمت، بیچ والی محرابون کے اوپر بڑے بڑے طاقچے ہین، ان مین پتھر کی جالیان اندر کی طرف پیوست ہین، آپ ان کو ایک قسم کی گیلری تجویز کر سکتے ہین،

سامنے کے رُخ دُوسری چبوترہ پر چڑھنے سے، داخلہ کے دروازے کے آس پاس اخیر کی دونون محرابون مین اوپر جانے کیلئے آمنے سامنے زینے ملین گے، سیڑھیون کی تعداد اُنیس اُنیس ہے، ایک خوش خیال مسلمان کا قیاس ہے، کہ حروف بسم اللہ کی رعایت سے یہ عدد فرد (۱۹) اختیار کیا گیا ہوگا، حفاظت و نگہداشت کے لئے ان زینون مین کواڑ لگا دئے ہین، نیچے شروع مین صرف پتھر کی چوکھٹ باز و ہے، اوپر پہنچکر زینہ کے ختم پر دروازے مین کواڑ ہین، کھولنے پر ایک چھوٹی سی مسطح جگہ اور اس کے بعد ایک قسم کی تنگ کنگنی (کارنس) ملتی ہے، کسی وقت لوگ باحتیاط کھسک کر محرابون مین آجاتے تھے، اور محرابون کے پاس سے جو گھومتا ہوا زینہ اوپر گیا ہے، اُس پر چڑھ جاتے تھے، یہ مرحلہ خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لئے کواڑ اب بند رہتے ہین اس انسداد مین ایک مصلحت ظاہری مزار کی حُرمت و تعظیم بھی کارفرما ہے،

چھت کے چارون کونون پر نہایت مختصر بلکہ برائے نام منارے ہین، گوشے خالی نہین چھوٹے لوہے کی سیخون پر چڑھا دو اور کے کلس پہنا کر ایک مخروطی شکل و ہیئت پیدا کر دی گئی ہے، اُس سے کچھ ہٹ کر گنبد کے متصل (دونون کے وسط) مین ایک ایک گومتی بنی ہے، جسکو بعض لوگ (شاید فن کی زبان مین) گلدستہ کہتے ہین، یہ ضرور خوشنما اور مشرقی تکلفات کی علمبردار و یادگار ہے، ہلکے پھلکے چھوٹے چھوٹے آٹھ آٹھ ستونون پر چھجے کے لئے پتھر لگا کر بقدر مناسب باہر نکال کر اوپر

ایک خوبصورت گول قبہ بنا دیا ہے، کم و بیش گولائی، اونچائی، اور مختلف وضع کے کلس اوسکی رونق بڑھا رہے ہین، یہ ایک ہوا دار خوبصورت نشیمن ہے، مگر وہان تک پہنچنا یا بیٹھ کر لطف اوٹھانا دشواری و نزاکت سے خالی نہین،

مقبرہ پر ایک بہت بڑا گنبد سایہ افگن اور قبر کے پورے دور پر محیط ہے، یہ عظیم الرفعت برج سقف عمارت کے وسط یا نیم دیوار کے اندر والے حصے پر سے اٹھایا گیا ہے، جس سے نہ صرف عمارت مین حُسن پیدا ہوگیا، بلکہ دوبالا ہو جاتا ہے، اور اس مقبرہ کو خسرو باغ کی تمام تعمیرات سے ممتاز و شاندار بنا رہا ہے، حسب معمول اس پر بھاری بھاری اٹھتے بنے ہین چوٹی پر کلس ہے،

عمارت تمام و کمال سنگ سُرخ کی ہے، اس کے ساتھ سنگ کھٹو یعنی زرد رنگ کے پتھرون کا استعمال و انضمام ایک خاص کیفیت و لطف پیدا کرتا ہے، جالیان سب لال پتھر کی ہین، انکا قدرتی رنگ چونے کی سفید قلعی سے اب بے رونق و بدزیب ہوگیا ہے، اندر چونے اور گچ کی استرکاری ہے، مگر سچ یہ ہے کہ ایسی سنگ تراشی و نقاشی کے نمونے الہ آباد کی بعض پُرانی مساجد اور خانقاہون مین بھی نظر آتے ہین، کوئی بے نظیر چیز نہین، دیوار کی چوڑائی ٹھوس ہو یا نمائشی چودہ فٹ ہوگی، یہ بھی تعجب کی بات نہین، جہانگیر کے مقبرہ واقع شاہدرہ (لاہور) کی دیوارون کا آتار پانچ گز سے کم نہین پایا جاتا، مقبرہ مین داخل ہونے کے لئے ہر طرف صرف ایک ایک دروازہ وسط کا کھلا رکھا گیا ہے، باقی دروازے سنگی خوشنما پھولون اور غلہ دار جالیون سے بند ہین، فی الحال صرف دکھن رُخ کا بیچ والا دروازہ قبر تک آنے جانے کے واسطے نامزد ہے، باقی تمون کے مقفل رہتے ہین، چوکھٹ باز و پتھر کے ہین، اور کواڑ لکڑی کے، ہندوستانی طرز کے مگر معمول سے کسی قدر زیادہ خوش وضعی کے ساتھ بنائے گئے ہین، تقریباً مربع ہین، بعض حصون پر کہنگی اور دیرینہ سالی نمودار ہے پچھم والا یقیناً تبدیل کرکے نیا لگایا گیا ہے، اس مین بھی اصلی نمونے کی پابندی کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے بدنما نہین قرار دئے جا سکتے سُرخ لاکھی رنگ بھرا ہے، اسی جنوبی (وسطی) دروازے کے اوپر محراب کے اندر دو پریان بنی ہین، رنگین ہین، بظاہر اسوقت کا درباری لباس زیب تن ہے، ایک کی شبیہ پوری پوری ہے، جو اڑ رہی ہے، اور کتاب کی سی کوئی چیز ہاتھ مین لئے ہے، دوسری کا صرف چہرہ اور پر بنے ہین، یہ تصویرین کسی اور دروازہ پر نہین ہین، قیاس کہتا ہے کہ چابکدست مصور یا نقاش نے اُس وقت

کی تصویر کھینچی ہے، کہ جسوقت (حسب روایت پیٹر منڈے صاحب) ملک الموت نازل ہوا تھا، اور شاہزادہ قرآن پڑھ رہا تھا، فرشتہ
کی صورت اہل ہنز یورپ سے مشابہ بناتے ہین، ہاتھ کی کتاب سے خدا کی کتاب مراد ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ رحمت کا فرشتہ
نذر و نیاز و درود و سلام کا پیشکش ہاتھ مین لیکر ایصال ثواب کی اجازت لینے عالم بالا کو جا رہا ہے، کسی ممتاز مسلمان کی گور پر تصویر کا
بنایا جانا ایک نئی اور تعجب خیز بات ہے، مگر یہان تو وہی، ع :- سر مزار مجاور بھی نوحہ گر بھی ہے،

حجرۂ قبر اندر کی جانب کچھ بلندی تک جہان محرابین ختم ہوتی ہین، چوکور بنا ہے، جہان سے گنبد کا دَور شروع
ہوتا ہے، گول ہو گیا ہے، چھت بھی خوب بلند ہے، اس کے نقطۂ علو کے گرد ایک دائرہ اور اس دائرے کے ہشت
پہل، ابھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے، اور ملاتے ہوئے دائرے، اور پھر دائرہ بناتے ہوئے رنگین پھول ہین
ان مین سے متصل ابھرے ہوئے مثلث اور توسین اور پھول بھی بنتے چلے گئے ہین، یہ مثلثون، توسون، اور دائرون کا
لگا تار سلسلہ ایسا ملا چلا آتا ہے، جیسے کوئی پھولون کا جال در جال اوپر سے نیچے تک بچھا ہو، حسرت ہے اور افسوس کہ
ناواقفیت فن و عدم ذہانت و مہارت کے باعث سے میرا قلم اس چیز کی صحیح صورت کشی سے عاجز ہے، اور اس طلسم
رنگین کو محض ایک گورکھ دھندا بنا کر چھوڑنا چاہتا ہے، ورنہ اہل نظر کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ کام اور یہ رنگ آمیزی مغلون کے
عہد زرین کی پینٹنگ اور نگار بندی کی بہترین یادگار ہے، اور الہ آباد کی لئے مایۂ ناز،

اس کارنامۂ رنگ و جمال کے نیچے، مگر محرابون کے اوپر چارون سمت اشعار لکھے ہین، یعنی تاریخ کا پورا قطعہ گرد
مین سیاہی سے مرقوم ہے، مقبرہ کے اندر اُس حصہ پر جو مربع ہے، طاقون پر "اللہ، اللہ" اور محرابون کے دونون جانب
نستعلیق مین کلمہ طیبہ لکھا ہے، کندہ نہین ہے،

در و دیوار پر چارون طرف پھول پتے بنے ہین، محرابون اور طاقون کے گرد کے بیل بوٹے بالخصوص دلآویز
سرو شمشاد کے جھاڑ بھی ہین، یہ تمام نقش و نگار پختہ شوخ رنگ، مصالحون سے بنائے گئے تھے، دست و برد زمانہ سے
شکستہ ہو رہے ہین، مرمت مین عمارت کے حفظ و بقا کا انتظام کیا جاتا ہے، نقوش اور گلکاریون کے قائم اور برقرار
کا التزام مد نظر نہین رہتا، اسی طرح طاقون پر جو کچھ کام تھا یا تکلفات تھے، ان کو صدیون کے امتداد اور چراغون

اندھیرے نے تقریباً محو و صحو کر دیا ہے،

سلطان خسرو کی قبر عرف عام مین، اوسکی بے گناہی اور خون ناحق کے سبب سے یار شہا ور وانجا مزار کہلاتی ہے،
مسٹر فنچ اپنے سفرنامہ مین لکھتے ہین[۱]، کہ "مسلمان بادشاہون کی قبرین عام طور پر متبرک مانی اور سمجھی جاتی ہین، ان کا
بڑا ادب و احترام کیا جاتا ہے، مسلمانون کی نسل کا یہ ایک طرۂ امتیاز ہے، کہ وہ اپنے بادشاہون کو پیوند خاک ہو جانے
کے بعد بھی یاد رکھتے، اور بڑے خلوص و وفا کے ساتھ اظہار تعظیم و طاعت کرتے ہین"، تربت سوا تین فٹ بلند چبوترہ پر واقع
ہے، جس کا طول و عرض یکسان ہے، ساڑھے تیرہ تیرہ فٹ، تعویذ دو فٹ اونچا ہوگا، آٹھ فٹ لمبا، چار فٹ چوڑا، سب
ملا کر قبر کی بلندی، سوا پانچ فٹ ہوئی، چبوترہ کی بغلی دیوارون مین تین تین دلے خوشنما جدولون سے محصور ہین، قبر پر
ایک انچ موٹا، مضبوط چونے کا پلاسٹر ہے، جسکو اوس وقت کے طریقہ پر پالش کر کے جلا دی گئی تھی، سنگ مرمر کے مثل
چمکنے لگا، مگر مرور زمانہ سے اب اس مین وہ آب و تاب باقی نہین رہی، ماند ہوتی جاتی ہے، دھندلا پن اور خاکستریت چھا گئی
ہے، اور دو جگہ مصالحہ بھی اوکھڑ گیا ہے، جس سے یہ کیفیت و حقیقت کھل گئی، ورنہ اس لطیف و نازک صناعی کی بدولت ہر
دیکھنے والا سنگ مرمر کا دھوکا کھا جاتا ہے،

تعویذ کے باہر چارون گوشون پر چودہ چودہ انگل کے فصل پر چوکور سوراخ ہین، خادم و مجاور کہتے ہین، کہ کچھ زمانہ
پہلے یہان نقرئی ستون نصب تھے، جو زبردستون کی دراز دستی کے نذر ہو گئے، اوراق تاریخ شاہد ہین، کہ انھین چاندی
سونے کے کھمبون پر مخمل کے زرین شامیانے کھڑے کئے جاتے تھے، پادری منڈی صاحب نے لکڑی کا کٹہرہ (کٹھرہ)
اور سیپیون اور موتیون کی جڑائی یہین دیکھی تھی[۲]، آج اسکا نشان بھی باقی نہین، نہ کوئی پتہ دیتا ہے، آج حسرت سے دیکھتا ہون
در و بام کی طرف، خیال رہے کہ اس قسم کی قیمتی نذرون نفیس و باریک دست کاری کی چیزون اور آبنوس پر لطیف و نازک
پچی کاری کے چپرکھٹون کا مقابر پر چڑھانا اور لگانا صاحب مقدرت لوگون مین عام طور پر رائج تھا، جس کے قابل دید نمونے
شیخ سلیم چشتی کے روضہ[۳] (فتحپور سیکری) اور خواجہ نظام الدین کے مزار[۴] (دہلی) پر اب تک موجود اور اپنے اولو العزم

[۱] منڈی [۲] سیاحت مقبول، ص ۹ سفرنامہ مسٹر فنچ ص ۱۲، [۳] آثار الصنادید ص ۳۵ مفتاح التواریخ ص ۲۴۳، [۴] تحفۃ الامرار ص ۵۳،

عقیدتمندون کی یادگار ہین،

خسرو کی قبر کے ادھر اودھر (پورب پچھم) نسبتۂ چھوٹی چھوٹی دو قبرین شہ نشینون مین ہین، ایک داہنے پہلو مین سے دو
بائین مین، اُن پر کوئی کتبہ نہین جس سے صاحبِ قبر کا پتہ چل سکے، ایک کے تعویذ پر صرف اللّٰہ اللّٰہ کندہ ہے، مجاورون کا بیان
ہے، کہ پورب والی قبر مرد (لڑکے) کی ہے، پچھم والی لڑکی کی، ہیئت کذائی بھی اس قول کی تصدیق کرتی ہے، کس کا لڑکا تھا
کون سی لڑکی؟ یہان کیسے پہنچے؟ کیا نام تھا؟ تاریخ کی زبان اس بارہ مین خاموش ہے،

قبر کے دکن ایک تنگ کھڑکی ہے، جس کے اندر زمین دوز راستہ بنا تھا، مگر اس وقت بند ہے، غیر مستند و غیر محقق روایت
ہے، کہ اکبر اکبر کے قلعہ تک جاتا تھا، جسکو بعض مصلحتون سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد نے مسدود کرا دیا، میرے
نزدیک سرنگ کا قصہ بداہۃً غلط اور ایک بے بنیاد فسانہ ہے، یہ راستہ قبر والے تہ خانے تک پہونچ کر ختم
ہو جاتا ہوگا،

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل، ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی یہ مختصر تحریر[۱] جزواً درست ہے کہ مقبرہ پر ایک خوبصورت
گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہے، اس کے اندر پھولون اور چڑیون کی تصویرین ہین، بے شبہہ مقبرۂ خسرو اپنی وسعت و فسحت
اور عالی شان برج کے لحاظ سے، یا یون کہئے کہ بحیثیت مجموعی اپنے ہمسایہ مقابر بلکہ ضلع الٰہ آباد کی تمام متفرق شاہی عمارات
سے نمایان اور بلندی و خوبصورتی مین ممتاز ہے، لیکن تاج کے ساتھ اوس کی مماثلت کیا ہو سکتی ہے، تاج، دنیا کا
اوس کے سالہائے دراز بعد بنا ہے، مقبرۂ خسرو کے لئے اوس کی نظیر شاید بے نظیر شہرت و نام کی وجہ سے
دی گئی ہو،

خسرو نے بھری جوانی مین جان دی تھی، فرزانگان فن کا تجربہ ہے، کہ جس درخت کی شاخین بہار مین
اٹھان کے وقت کاٹ دی جاتی ہین، وہ خوب بڑھتا، اور پھیلتا ہے، خسرو کی نود پودہ تو برابر قطع ہوتی رہی، بڑھ
نہین پائی، مگر شاید اس کلیہ کے ماتحت مزار خسرو کے خادم و مجاور یا مقبرہ کے محافظ ابھی عمر پاتے ہین، موجودہ خادم

[۱] مطبوعہ ۱۹۰۸ء جلد اول صفحہ ۱۵۸ نمبر ۱۰۳ مطبوعہ ۱۸۸۵ء،

اسی سال کا ایک پیر مرد ہے، اس کا پیشرو اس کا بڑا بھائی سو برس کا ہو کر دنیا سے رخصت ہوا،

خسرو اور اوسکی مادر گرامی نژاد کے مقابر کے گرد و پیش کی آبادی اور تعمیرات شاہی کا سلسلہ خلد آباد کہلاتا ہے،
گو سلاطین کے متصل بستیون کا یہ نام تبرکاً و تیمناً اور جگہ بھی رکھا گیا ہے، زمان و مکان کی قید نہین، دکن مین اورنگ آباد
کے قریب شہنشاہ عالمگیر کے روضہ کے اطراف کو بھی یہی شرف تسمیہ[۱] حاصل ہے، سرکاری گزیٹیر کی روایت ہے کہ خسرو کی جلا وطنی
کی حالت مین خلد آباد کے سادات نے اوسکی رفاقت کی تھی، مگر اپنے ماخذ یا کسی تاریخ کا حوالہ نہین دیا جس سے ان شرفا کے
نامون اور کارنامون کا علم اور عصر حاضر مین ان کے اخلاف کی تحقیق و تصدیق ہو سکے، نہین جانتا کہ زمانہ جلا وطن سے لکھنے
کا مقصود کیا ہے، خسرو کی پوری زندگی مین کچھ دن بھی ایسے نہین پائے جاتے، جن پر اوس کی تعریف صادق آسکے، بچپن، اور
کچھ جوانی دادا جان (اکبر) کے دربار اور سایۂ شفقت مین امن و امان، عیش و فراغت کے ساتھ گذری، اس کے بعد باپ کی نظر بندی
و نگرانی مین بھاگا، لڑا، پکڑا گیا، اور عمر بھر قید و حبس مین رہا، خسرو کی تمام کارزار حیات اور کارنامون مین اسکے رفقا اور جان
نثارون کی فردین جو گرفتار اور بعد ازان لقمۂ نہنگ اجل ہوتے رہے، کسی الٰہ آبادی کا نام نہین ملتا،

کہہ چکا ہون کہ شاہزادہ کی عظمت اور اوسکے روضہ کی حرمت عوام مین اب بھی باقی ہے، برسات کے موسم مین
ہین، اُس کے مزار پر ہر سال میلا لگتا ہے، شیرینی چڑھائی جاتی ہے، رات کو روشنی ہوتی ہے، گانا بجانا بھی، خسرو باغ
کا بڑا پھاٹک جو معینہ قواعد و احکام کے بموجب معمولاً بند کر دیا جاتا ہے، اس شب کو کھلا رہتا ہے، یہ رات اس پھاٹک اور
اس باغ کیلئے شب برات، رونق اور چہل پہل کا باعث ہوتی ہے، جنت نصیب شاہزادہ کی بدولت باغ کے دن بھی

[۱] ایلورا کے غارون سے پون میل اور دولت آباد سے ساڑھے آٹھ میل کے فاصلہ پر حضرت شاہ برہان الدین غریب
کا روضہ (مرقد مبارک) مسلمانون کی مشہور زیارت گاہ ہے، جس کے پائین دفن ہونے کو نظام الملک آصف جاہ نے بھی سعادت
و برکت کا باعث سمجھا تھا، یہ مقام پہلے روضہ کہلاتا تھا، اورنگ زیب خلد مکان دفن ہوا تب سے خلد آباد کہلاتا ہے،
(مفتاح التواریخ صفحات ۴۴۱ و ۴۹۵، وتاریخ اگرہ صفحہ ۶۱) قاموس المشاہیر صفحہ ۱۲۶، ۵۳، سلسلہ جدید جلد ۲۳
صفحہ نمبر ۹۶۔

پھر جاتے ہین، اسی رات مین پھاٹک پر نعل چڑھائے جاتے، کیونکہ سے جڑے جاتے ہین، پہلے سونے چاندی کے بھی ہوتے تھے، جن کی دیکھنے والی آنکھین اور شہادت دینے والے لوگ اب تک باقی ہین، لیکن کفایت شعاری کی وجہ یا حقیقۃً افلاس کے مارے اب عموماً لوہے کے رہ گئے ہین، اس اجتماع مین حسب معمول ہندوؤن کی تعداد زیادہ ہوتی ہے ہوتی تھی، مسلمانون کی کم خوش اعتقاد مسلمانون کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کا سالانہ عُرس سمجھا جاتا ہے، اور ہندوؤن کی یا رسوم کے اعتبار سے ملک کی بول چال مین میلا، بہر صورت حاجت مندانِ عقیدت کیش خسرو شہید کے بابرکت مزار سے اب بھی منتین مانتے، مرادین مانگتے، اور سب کچھ پاتے ہین، مشعلین اور روشنی ساتھ لاتے اور قبر پر حسب حیثیت نذرین چڑھاتے رات کے آٹھ نو بجے تک ایک اچھا خاصہ صاف ستھرا، شہری نیز دیہاتی، ملا جلا، مجمع دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے، البتہ یہ مجاور برابر کم ہوتا جاتا ہے، کچھ تو اعتقادات مین فرق آنے کی وجہ سے اور کچھ مخلوق کے اپنے اپنے اشتغالات اور موجودہ اختلافات کے باعث سے،

حتی کہ اب شہر کے اعلیٰ وادنی بھی اس سے کم واقف ہین کہ مجاورون مین جب کہ یہان سے پچھم جانب کچھ دور پر سلیم سرائے کے قریب، ماموں بھانجے کا میلا دیوگیری مین (ہندون کا) لگتا ہے، تو اوسی کے ساتھ اسی مہینہ (یعنی اگست) کی پہلی دو جمعراتون کو یہان بھی ہوتا ہے، مقامی شہرت واہمیت گھٹ جانے کے سبب سے، یا یہ کہ حسب دستور سابق عُرس مجاورون کو کسی قدر اہتمام واعلان کرنا پڑتا ہے، پھاٹک پر نقارہ بجایا جاتا ہے، لوگ آجاتے ہین، اور شاہزادے سے محبت وعقیدت رکھنے والے جمع ہو کر اس کی تربت پر دو پھول چڑھا دیتے ہین، آپ جائین گے اور کتنی ہی مدت گزری ہوگی تو بھی کچھ نہ کچھ باسی ہار اور بکھری ہوئی، پژمردہ وافسردہ کلیان وہان دیکھین گے، گزٹیر والون نے (میلون کی) فہرست مین اس کو شامل نہین کیا ہے، بعض اور میلے بھی جن کی نوعیت بالکل مذہبی رہ گئی ہے، نذر کر دئے ہین[1]

(باقی)

---

[1] ڈسٹرکٹ گزٹیر جدید جلد ۲۳ صفحہ ۹۶۔

تاریخ اسلام کا ایک ورق

۷۶۷ھ مین اسکندریہ کی تباہی اور اوس کے چشمدید حالات

از

مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مہتمم تالیفات ریاست رامپور وسابق رفیق دار المصنفین،

ممالک اسلامیہ پر صلیبی مجاہدین کے حملون کا سلسلہ گیارہوین صدی عیسوی کے اخیر سے شروع ہو کر چودہوین صدی کے وسط تک جاری رہا، اس سلسلہ کی آخری کڑی وہ تھی، جو ۷۶۷ھ مین اسکندریہ پر بلائے آسمانی کی شکل مین نازل ہوئی، اس حملہ کا علمبردار قبرس کا فرمانروا پیٹر اول (PETER-I-) تھا، اس نے قبرس پر ۱۳۵۹ء سے ۱۳۶۹ء تک حکومت کی، انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا کے مضمون نگار کا بیان ہے، کہ چودہوین صدی مین صلیبی جہاد کا عام جوش سرد پڑ گیا تھا، اور اس وقت سمی دنیا مین صرف پیٹر ہی ایک ایسا تاجدار تھا کہ جس نے ارض مقدس کی واپسی کے لئے اپنی تلوار بے نیام کی، اور اس کے وزیر اعظم پی ڈیمیزرس (P.DE. MEZIERES) نے تمام یورپ کا دورہ کر کے اس آگ کو پھر بھڑکانا چاہا، اگرچہ سلاطین یورپ اس جنگ مین شریک نہین ہوئے تاہم اس وزیر کی کوشش سے پرستارانِ صلیب کی ایک بڑی جماعت قبرس مین مجتمع ہو گئی، اور خود شاہ قبرس کی زیر قیادت حضرت مسیح کی ان بھیڑون نے اسکندریہ مین وحشت وبربریت کا وہ ہولناک منظر پیش کیا، کہ اوس کے تخیل سے آج بھی آنکھون مین خون کے آنسو بھر آتے ہین،

اس واقعۂ ہائلہ کے متعلق کتب خانۂ مشرقی پٹنہ مین تقریباً پانچسو صفحات کی ایک ضخیم کتاب موجود ہے، ٹائٹل پیج پر کاتب نے اپنی جہالت سے کتاب کا نام مرأۃ العجائب للواقدی" لکھدیا ہے، اس کتاب کا ایک غیر مکمل نسخہ برٹش میوزیم

لندن مین بھی ہے، مگر وہ شاید ہمارے اسی نسخہ کی نقل ہے، یا کم سے کم دونون ایک ہی اصل سے منقول ہین، کیونکہ "مرأة ال[illegible] لواقدی" والی غلطی بعینہ وہان بھی موجود ہے، اس کتاب کا ایک تیسرا نسخہ برلن کے کتب خانہ مین ہے، اس مین مصنف کا نام مذکور نہین ہے، لیکن کتاب کا صحیح نام مندرج ہے، خود مصنف نے زیر تبصرہ نسخہ کے ص۲ مین اس کتاب کو "الالمام فیما جرت من الاحکام والامور المقضیة من وقعة الاسکندریة" کے نام سے موسوم کیا ہے، اگرچہ مصنف کا نام بالتصریح موجود نہین ہے، تاہم وہ اپنی نسبت "النویری" کو اکثر ذکر کرتا ہے، علاوہ برین ص۲۲ مین مصنف اپنے ایک قصیدہ مین جسکو اوس نے ایک دوست شیخ شرف الدین ابو حفص عمر بن سید الناس صدر مدرس مدرسۂ مالکیہ فیوم کی تعریف مین لکھا ہے، اپنے کو ابن قاسم کے نام سے مخاطب کرتا ہے، چنانچہ وہ شعر جسمین یہ نام آتا ہے درج ذیل ہے:-

ان ابن قاسم مخلصالك بالدعاء

یرجو الاجابة من اله الناس،

مذکورۂ بالا تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ درحقیقت یہ وہی کتاب ہے، جس کو حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (جلد ص۸ مطبوعہ یورپ) مین تاریخ اسکندریہ کے سلسلہ مین اس طرح بیان کیا ہے:-

وفی وقعتها الحادثة کتاب لمحمد بن قاسم النویری المالکی المتوفی ۷۷۵ھ

صاحب کشف الظنون نے جو سال وفات درج کیا ہے، وہ یقیناً غلط ہے، کیونکہ ص۱۸۲ مین مصنف کا بیان ہے، کہ اوس نے اوسکی تصنیف سے ۷۷۵ھ مین فراغت پائی، اس لئے وہ اس وقت تک یقیناً زندہ تھا، علامہ ابن حجر العسقلانی نے الدرر الکامنہ مین محمد بن قاسم النویری کا مختصر تذکرہ دیا ہے، مگر زیر مطالعہ نسخہ مین سال وفات مذکور نہین،

خود اس کتاب سے مصنف کے متعلق جسقدر حالات دستیاب ہو سکے، وہ یہ ہین، کہ ۷۳۶ھ مین وہ اپنا وطن النویرہ چھوڑ کر بتلاش معاش اسکندریہ پہنچا، اور اوس کو ایک نہایت ہی خوبصورت اور پر رونق شہر پا کر ہمیشہ کے لئے متوطن ہو گیا، کتابین نقل کرنا، اور اون کو علم دوست امرا ورؤسائے شہر کے ہاتھون فروخت کرنا اس کا پیشہ تھا، ۷۶۷ھ مین جب پیٹر اول (PETER-I-) اسکندریہ پر حملہ آور ہوا تو ہمارا مصنف بھی مدافعین کی جماعت مین ایک مرد میدان کی طرح

شریک کارزار ہوا، اہل قبرس کا یہ حملہ بالکل ناگہانی تھا، مسلمان بالکل غافل تھے، اسکندریہ کا حاکم حج کے سفر مین تھا، اس کا قائم مقام نہایت ہی ناتجربہ کار و ناعاقبت اندیش تھا، شاہی افواج بھی یہان سے دور تھین، صرف شہر کے رضا کارون نے ساحل پر ان مسیحی حملہ آورون کو جنہین تمام یورپ کے منتخب نبرد آزما شامل تھے، روکا، تھوڑی دیر تک تیر و تفنگ کی بارش رہی، مجاہدین صلیب اپنی آہنی ڈھالون کی پناہ مین کشتیون سے کود کود کر خشکی پر چڑھ آئے، کچھ عرصہ تک دست بدست کی جنگ رہی، بالآخر مسلمان پسپا ہوتے ہوئے، شہر کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہوئے، مگر یہ قبرسی فاتحین درندون کی طرح شہر مین گھس پڑے، اور عورت، مرد، بوڑھے، بچے، غرض ہر جاندار یہان تک کہ گھوڑے اور گدھے بھی نہایت ہی بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دئے گئے، مصنف کا بیان ہے کہ اہل قبرس ایک خاص قسم کی آتشگیر چیز اپنے ساتھ لائے تھے، اس کو چھتون اور دروازون پر ڈال دینے سے فوراً آگ بھڑک اٹھتی تھی، غرض پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا، جو لوگ جان بچا کر بھاگ سکے، اُن مین ہمارا مصنف بھی تھا، اپنے اہل و عیال کو لیکر اپنے قدیم مسکن النویرہ پہنچا، وہان علامہ ابن سید الناس اس سے ملکر اسکندریہ کی المناک تباہی کا حال دریافت کرنے آئے، مصنف نے اون کو اپنا وہ قصیدہ سنایا، جس کا ایک شعر اوپر مذکور ہوا، تھوڑے دنون کے بعد جب کہ سلطان مصر کی افواج قاہرہ نے اسکندریہ مین امن وامان قائم کر دیا، اور جو لوگ جان بچا کر بھاگ نکلے تھے، وہ پھر وہان واپس آنے لگے، تو ہمارا مصنف بھی اس ویرانہ کی زیارت کے لئے آیا، اوسکو اس اجڑی ہوئی حالت مین دیکھ کر اس کا دل بھر آیا، آنکھون نے خون کے آنسو بہائے، اور دل مضطر نے مرثیہ کی شکل مین اپنے جذبات درد والم کا اظہار کیا، اوس نے جو مرثیہ لکھا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

عاذلی لا تلم وخلّ ملامی

فعیونی بجلد الدموع دوامی،

مرثیہ خوانی سے فارغ ہو کر اس واقعۂ ہائلہ کی یاد قائم رکھنے کے لئے اوس نے زیر تبصرہ تاریخ مرتب کی، اگرچہ اس کتاب کا موضوع تباہی اسکندریہ کی تاریخ ہے، تاہم ضمناً الشیٔ بالشیٔ یذکر کے اصول پر ابتدائے عہد نبوت سے آٹھوین صدی تک کے تمام اہم تاریخی واقعات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ دہرایا گیا ہے، کہ اصل موضوع گم ہو کر رہ گیا ہے، مصر کی

سیاسی حالت اور تباہی اسکندریہ کے بعد جو واقعات رونما ہوئے، ان کو ہم کتاب کے مختلف حصون سے ڈھونڈھ کر ناظرین کی دلچسپی
کے لئے یہان درج کرتے ہین،

اسکندریہ کی تباہی کے وقت سلطان الملک الاشرف ناصر الدین شعبان (۷۶۴ھ-۷۷۸ھ) مصر کا محض برائے نام
بادشاہ تھا، الامیر الاتابکی یلبغا الخاصکی تمام سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا، بحری مملوک سلاطین مصر کے آخری عہد مین اس
امیر نے سلطان گر کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اس کے پاس دو ہزار غلام تھے، ان کو جلبان کہا جاتا تھا، یہ نہایت ہی سرکش
اون کے ظلم و تعدی سے اہلِ مصر عاجز آگئے تھے، اُن کی سرکشی بالآخر یہان تک بڑھی، کہ انھون نے خود اپنے آقا امیر یلبغا کو مار ڈ
اور اوس کے بعد سلطان شعبان پر حملہ آور ہوئے، مگر مصر کی رعایا نے سلطان کی بروقت مدد کی، اور یہ جلبان ۷۶۸ھ مین ایک
ایک کرکے مار ڈالے گئے، اب سلطان نے آزادی کے ساتھ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ مین سنبھالی، مصنف اوس کی دادرسی
و رعایا پروری کی تعریف کرتا ہے، اور اوس کے طولِ حیات، دوامِ حکومت و استحکام مملکت کیلئے نہایت ہی خلوص کے ساتھ
بارگاہِ رب العزت مین دعاگو ہے،

مذکورۂ صدر تصریحات سے یہ صاف عیان ہے، کہ جس وقت پیٹر اول (PETER-I-) نے
شام کے ساحلی شہرون مین قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس وقت دربارِ مصر کی حالت نہایت ہی بد سے بدتر تھی
اور غلامون کے ظلم و تعدی سے رعایا تباہ ہو رہی تھی، تاہم اسکندریہ کی تباہی نے مسلمانانِ مصر کی آنکھین کھولدین، ہر طرف
سے انتقام انتقام کی صدائین بلند تھین چنانچہ اس واقعہ ہائلہ کے بعد امیر یلبغا نے مصر و شام کے سواحل مین جنگی جہازات
کی تعمیر کے لئے متعدد کارخانے کھلوائے اور مصنف کے بیان کے مطابق صرف تھوڑے ہی عرصہ مین ایک سو پچاس
کا ایک مضبوط بیڑا تیار ہو گیا، یہ ہر قسم کے سامان و اسلحۂ جنگ سے آراستہ تھا، اس مین دو قسم کے جہازات تھے، ایک کو "
بحیل" اور دوسرے کو شوانی الغزو کہا جاتا تھا، بحری فوج اور سلاحون کی تعلیم و تربیت اندلس کے ایک امیر المجر ابراہیم
التازی کے سپرد تھی، الغرض جب یہ بیڑا پوری طرح مکمل ہو گیا، تو دریائے نیل مین امیر یلبغا کے سامنے اون کی نمائش
ہوئی، ان جنگی جہازات کے بالمقابل خشکی پر بری افواج بھی صف بستہ تھین، اس طرح تری اور خشکی مین ایک سا

جان بازی و بہادری کے کرتب دکھائے جا رہے تھے، دریائے نیل کے کنارے لاکھون تماشائیون کا مجمع تھا، ان مین
جزیرہ کیتلان کے سفرا بھی موجود تھے، واقعہ اسکندریہ کے ساتھ دربار مصر مین یہ اس لئے حاضر ہوئے تھے کہ اہلِ
قبرس کی سفاکی پر صاحب کیتلان کی طرف سے بیزاری کا اظہار کرین، مصنف نہایت ہی جوشِ مسرت کے ساتھ اسلامی
شان و شوکت کے اسی پر رعب منظر کا نقشہ کھینچتا ہے، اور کہتا ہے، کہ کیتلان کے سفراء پر اس نمائش کا بہت اچھا
اثر پڑا ہوگا، انھین معلوم ہو گیا ہوگا، کہ صرف ایک سال کی مدت مین اسکندریہ کی تباہی کا انتقام لینے کیلئے مصر کیسی عظیم الشان تیاریان
انتقامی تیاریون کے ساتھ ساتھ تعمیر اسکندریہ کی تجدید کا کام بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہو رہا تھا، یہ خدمت امیر
سیف الدین الاکز والیِ اسکندریہ کے سپرد تھی، اس نے بہت جلد اس کھنڈر کو پھر عروس البلاد بنا دیا، اہل شہر کی راحت
و آسایش کے لئے کشادہ سڑکین نکالی گئین، مساجد و مدارس کی ترمیم و تعمیر عمل مین آئی، مریضون کے لئے ایک عظیم الشان
مارستان (اسپتال) کی بنیاد ڈالی گئی، اس مین ہر وقت ہر قسم کی دوائین مہیا رہتی تھین مریضون کی عافیت و آسایش
کا خاص انتظام تھا، مصنف کا بیان ہے کہ اس زمانہ مین مصر کا سب سے بڑا مارستان قاہرہ کا "المارستان المنصوری" تھا،
مگر اسکندریہ کا یہ جدید مارستان اپنی عظمت مین اس سے بھی بڑھ گیا، اس کا نام "المارستان الصلاحی" تھا، بلدیہ کیطرف سے سڑکون
اور گلیون کی جاروب کشی اور صفائی کے بہترین انتظامات عمل مین آئے، سڑکون پر روشنی کا ایسا عمدہ انتظام کیا گیا کہ سارا شہر رات کو بقعۂ نور نظر
آتا تھا، شہر کی حفاظت و قلعہ بندی کی طرف بھی خاص توجہ منعطف کی گئی، شہر پناہ کی دیوار مستحکم کی گئی، اسکے دروازون پر تیر اندازون کے
لئے لکڑی کے برج بنوائے گئے، اور اون کو گائے اور گدھے کی کھالون سے منڈھا گیا، مصنف کا بیان ہے کہ کھالون
سے منڈھے جانے کے باعث یہ دشمن کی آتشباری سے محفوظ ہو گئے تھے، شہر کے دروازون مین لوہے کے پھاٹک
لگوائے گئے، یہ ایک مشین کے ذریعہ سے جب ضرورت ہوئی، اوپر اوٹھا لئے جاتے، اور جب ضرورت ہوتی نیچے
گرا دئے جاتے، اس قسم کے دروازے تعاقب کرنے والے حریف کو شہر مین داخل ہونے سے روکنے کے لئے زیادہ
مفید خیال کئے گئے تھے، شہر کی مشرقی سمت مین خندق نہین تھی، اور اسی طرف سے اہلِ قبرس شہر مین گھس آئے تھے،
چنانچہ اس تجدید تعمیر کے وقت اس جانب بھی ایک بڑی خندق کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا گیا، اس سلسلہ مین مصنف

نے چند جدید اختراعات کا ذکر کیا ہے، اون کو ہم یہان کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہین،

آتشبار مشعل اسکندریہ کے "دار الصناعۃ الحربیۃ" نے ایک خاص قسم کا مشعل ایجاد کیا تھا، جو رات کو روشنی کا کام دیتا تھا، اور ضرورت کے وقت دشمن کے جہازات یا مکانات پر آتشباری کرکے اون کو خاک سیاہ کر سکتا تھا،

المکاحل یہ چھوٹی توپچی کے مانند ایک چیز تھی، بارود کی قوت سے یہ دور دور تک تیراندازی کا کام دیتی تھی،

رقائق الحدید یہ لوہے کے نہایت ہی تیز کانٹے تھے، ضرورت کے وقت ہانڈیون مین بند کرکے منجنیق کے ذریعہ سے دشمن کے راستون مین پھینکے جاتے تھے، یہ اس کثرت کے ساتھ راستہ مین پھیل جاتے، کہ دشمن کو قدم بڑھانا دشوار ہوجاتا،

قدور النفاط قدور ہانڈیون مین ایک خاص قسم کا تیزابی مادہ جو پیشاب سے تیار کیا گیا تھا، بھرا جاتا، اور ان کو دشمن پر پھینکا جاتا، اس کا ہر قطرہ دشمن کی بصارت جسم و قوای دماغی کو زائل کرنے کیلئے کافی تھا،

المدافع الکبار خاص قسم کی بڑی بڑی توپین بنوائی گئی تھین، اُن سے نہایت ہی تباہ کن پھٹنے والے گولے پھینکے جاتے تھے، یہ گولے آتشگیر اشیاء کی آمیزش کے ساتھ سنگریزون سے تیار کئے جاتے تھے، ہم اون کو اوس زمانہ کا بم کہہ سکتے ہین،

غرض ان جارحانہ و مدافعانہ تیاریون کی تکمیل کے بعد ۷۶۹ھ مین سلطان الملک الاشرف نے اسکندریہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کیا، اتابک الامراء استبغا نے تمام اہم مقامات کا ملاحظہ کرایا، سلطان نے ایک دربار منعقد کرکے ان لوگون کو جنھون نے اسکندریہ کی تجدید تعمیر و قلعبندی مین غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی تھی، خلعت و انعام سے مشرف فرمایا، امیر البحر ابراہیم کو علاوہ خلعت فاخرہ کے خاص اپنی سواری کا ایک قیمتی گھوڑا عطا فرمایا، اور مصر کے جنگی بیڑے کا افسر اعلیٰ مقرر کرکے اہل قبرس کی سرکوبی کی خدمت سپرد فرمائی،

ابراہیم التنازی ایک تجربہ کار بحری مجاہد تھے، عمر کا بیشتر حصہ سمندر کی لڑائیون مین بسر ہوا تھا، قبرس پر چڑھائی کرنے سے پہلے دشمن کی دیکھ بھال کے لئے ایک متجسسانہ بحری مہم لے کر روانہ ہوئے، صرف سات سو جانباز سپاہی اور دو جہاز کا ایک مختصر بیڑا ساتھ تھا، دشمن کو دھوکے مین رکھنے کے لئے ان لوگون نے فرنگی جہازرانون کی پوشاک اختیار کی تھی، یہ مختصر بیڑا تقریبًا ایک ماہ تک بحر روم مین چکر کاٹنے کے بعد واپس آیا، اور بہت سے قیدی اور مال غنیمت ساتھ لایا،

کامیاب بحری مہم اور مصر کی غیر معمولی جارحانہ تیاریون نے تمام جزائر بحر روم مین ہلچل برپا کر دی، اہل قبرس سے اظہار بے تعلقی کے لئے جنیوا، روڈس، اور بندقیہ (وینس) کے وفود آنے لگے، اور اون کی طرف سے مصالحت کی کوششین ہونے لگین، اہل قبرس اسکندریہ کے ہزارون عورتون اور بچون کو پکڑ کر لے گئے تھے، اُن مین سے اکثر بحر روم کے مختلف جزائر و ملحقہ ممالک مین غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے، چنانچہ سلطان نے ہر ملک کے وفد کو یہی جواب دیا، کہ جب تک وہ تمام اسیران اسکندریہ جو اُن کے ملک مین پائے جاتے ہون، واپس نہین آئین گے، اُوس وقت تک مصالحت کی گفتگو ناممکن ہے، سلطان کے اس اصرار کے باعث تھوڑے ہی عرصے مین قیدیون کی ایک بڑی تعداد واپس آگئی، مصنف ان قیدیون کو نام بنام بیان کرتا ہے، اور بعضون سے مل کر اون کی گرفتاری کے قصّے اور جن ممالک مین اون کو رہنے کا اتفاق ہوا، وہان کے حالات دریافت کرکے کسی قدر تفصیل کے ساتھ سپرد قلم کرتا ہے، اُن سے ظاہر ہوتا ہے، کہ زنان فرنگ کی بے حجابی و مردانہ وشی آٹھوین صدی ہجری مین بھی تقریبًا ویسی ہی تھی، جیسی کہ اس موجودہ دور ترقی مین ہے، مصنف کو اہل فرنگ کی بے شرمی و بے حیائی کے بہت سے قصّے سنائے گئے ہین، مگر وہ ان کو قصدًا نظر انداز کرتا ہے،

جن ممالک نے اسیران اسکندریہ کو واپس کیا تھا، وہان کے تجار کو مصر و شام کے سواحل پر تجارت کی اجازت دی گئی، اور امیر سیف الدین طغیہ ابن العرضی سلطان کی طرف سے تحائف لیکر فرمانروایان بندقیہ (وینس) جنیوا اور کیتلان کے دربار مین بھیجے گئے، اُن سے جو معاہدے ہوئے اون مین ایک شرط یہ بھی تھی، کہ وہ سلطان مصر کے مقابلہ مین اہل قبرس کی اعانت نہین کرین گے، سلطان مصر کی ان تیاریون سے اہل قبرس نہایت خائف ہوئے، اور کیتلان کے سفیر کی معرفت مصالحت کے لئے نامہ و پیام شروع کیا، سلطان کی طرف سے وہی اسیران اسکندریہ کی واپسی کی شرط یہان بھی پیش ہوئی، چنانچہ خاص قبرس مین جسقدر قیدی رہ گئے تھے، سفیر کیتلان کی وساطت سے وہ بھی واپس آگئے،

غرض ان مصلحانہ کوششون کے ساتھ ہی مصر کی سیاسی حالت مین بھی کچھ ایسا قدرتی انقلاب رونما ہوا کہ

قبرس کی چڑھائی کا خیال ہی جاتا رہا، امیر بیقا کی شہادت اور اس کے غلامون کے ہنگامہ و فساد نے سلطان کو ملک کی حالت درست کرنے پر مجبور کر دیا، دوسری طرف دربار قبرس بھی سیاسی ہیجان سے محفوظ نہین تھا، پٹیر اول (PETER- I-) کے خلاف ملک مین سازش ہوتی ہے، اور [illegible] مین وہ مارا جاتا ہے، اس کی جگہ برابر اس کا بھائی جس کو مصنف بزرگ کے نام سے یاد کرتا ہے، تخت نشین ہوتا ہے، اور اسکی مصالحانہ کوششین بالآخر ... کے جوش انتقام کو ٹھنڈا کر دیتی ہین۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا، وہ اصل موضوع کتاب کا ایک مختصر خلاصہ ہے، مگر جیسا کہ ہم کہہ آئے ہین، یہ کتاب اسلامی تاریخ کا کشکول ہے، تاریخ اسلام کے متعلمین و محققین اس سے بہت کچھ فوائد حاصل کر سکتے ہین، زیر ... نہایت ہی قدیم ہے یعنی [illegible] کا لکھا ہے۔

سیر الصحابہ

حصہ ششم

جسمین بترتیب چار امام یعنی حضرت امام حسن، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسین، اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے حالات و سوانح اخلاق و فضائل، اور ان کے مذہبی، علمی، اخلاقی، اور سیاسی کارنامون کی تفصیل ہے، ضخامت: ۳۰۶ قیمت ...

مہاجرین

حصہ دوم

یعنی ان صحابہ کرام کے حالات جمع کئے گئے ہین، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، اور ہجرت کی، ضخامت ...

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت ...

"منیجر"

دیوان نظامی کے قلمی نسخے

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڑھی

رسالہ معارف (نمبر ۱، جلد ۲۲) مین بعنوان بالا ہم نے دیوان نظامی کے پانچ قلمی نسخون کا ذکر کیا تھا، جنمین سے ... بہار، رامپور، اور باڈلی کے کتبخانون کے قلمی نسخون کی نقلین ہم نے حاصل کر لی ہین، اس سلسلہ مین ہم یہان اس دیوان کے دو اور نسخون کا تذکرہ کرتے ہین جنمین سے ایک کتب خانۂ خدیویہ مین محفوظ ہے، اور دوسرا مطبع نولکشور (لکھنؤ) کے کتب خانہ مین موجود ہے، اور جس کی ایک نقل ہماری استدعا پر مطبع مذکور کے مہتمم صاحب نے ہمارے لیے بہم پہنچائی ...

۱- نسخہ خدیویہ: کتبخانۂ خدیویہ مصر (بسرے درب الجامیز) کے فارسی مخطوطات کی فہرست مین اس نسخہ کے متعلق لکھا ہے[1]:

"دیوان نظامی، تالیف المولی نظام الدین ابی محمد جمال الدین یوسف بن ... الگنجوی الاویسی المتوفی سنۃ ۵۹۷ اولہ، یا اشرف البریہ یا سید الوری ... نظم تعلیق بخط بیر احمد بن اسکندر، تم تحریرہ فی سنۃ ۹۲۳ وهو باللغۃ الترکیۃ"

اس تحریر سے جہان یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ یہ دیوان انہی نامور شاعر نظامی کا ہے، جو گنجوی کہلاتے ہین، وہان یہ امر بھی کچھ کم تعجب خیز نہین ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان مین ہے، اگر واقعی یہ دیوان شیخ نظامی کا ہے تو شائقین ادب فارسی کے لیے یہ ایک نیا انکشاف ہوگا کہ نظامی ترکی زبان بھی جانتے تھے بلکہ اس مین شعر کہتے تھے، لیکن یہ ... ان کے کسی سوانح نگار یا تذکرہ نویس نے نہین لکھا اور نہ کہین نظامی کے کلام مین اندرونی طور پر اسکی کوئی

[1] فہرست الکتب الفارسیۃ والجاویۃ المحفوظۃ بالکتبخانۃ الخدیویۃ المصریۃ ص ۴۸۹

شہادت ملتی ہے، علاوہ ازین آغاز دیوان کے عربی شعر سے، جو عربی قصیدۂ نعتیہ کا مطلع معلوم ہوتا ہے، یہ قیاس
کہ اس دیوان مین ان کے عربی اشعار بھی ہونگے،

ہم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا یہ دیوان فارسی زبان مین ہے، یا ترکی مین اپنے ایک کرمفرما مصر کے عیسا
الیان سرکیس کو لکھا تھا کہ وہ اس دیوان کے متعلق ضروری معلومات سے ہم کو آگاہ کرین، چنانچہ انھون نے جو
مین لکھا ہے کہ

"یہ کتاب فارسی زبان مین ہے، ترکی مین نہین ہے، اس دیوان کے ۵-۶ صفحے الٹنے کے بعد اشعا
ذیل ملتے ہین:-

نظامی نطقگی نورسہ نظامی گنجہ   ادردی کنج لحدون کہ نم نیک مقال
دکل براہل معانی قتسندہ دون تج   محدث نم ایدر بو حال اہل مقال
طاب چتر سخن واکمن ولا اطناب   کہ تا بخاطر عاطر رسد گزند وملال"

ظاہر ہے کہ ان مین سے پہلے دو شعر ترکی زبان مین اور تیسرا شعر فارسی مین ہے، غالباً ہمارے کرمفر
مطلب یہ ہے کہ اس دیوان مین صرف چند اشعار ترکی زبان مین پائے جاتے ہین، لیکن اگر تمام دیوان اس
مین ہو تو پھر صاحب فہرست کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان مین ہے، ہم نے
مخطوطات مین ان اشعار کی تلاش کی مگر بے سود، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کے دیوان کے مختلف
ہین، چنانچہ عوفی نے اپنے تذکرہ مین جو غزلین نظامی کی نقل کی ہین، وہ بھی ہمارے ان مخطوطات مین نہ
پائی جاتین، اسی طرح ہرمن ایتھے نے بھی فہرست مخطوطات فارسی (بوڈلین لائبریری) مین لکھا ہے کہ اگر
([illegible]) نسخۂ دیوان بوڈلین کے قلمی نسخہ سے بالکل مختلف ہے، اس مین وہ قصائد اور غزلیات نہین پائی جا
جو اس نسخہ مین موجود ہین، اس سے دولت شاہ اور لطف علی آذر کے اس قول کی تائید ہوتی ہے، کہ خم
کے علاوہ نظامی کے قصائد وغزلیات، قطعات ورباعیات کے بیس ہزار اشعار ہین، اس کی مزید تائید اس

سے بھی ہوتی ہے کہ حال مین ادارۂ مجلۂ ارمغان طہران، خمسۂ نظامی کا ایک صحیح اڈیشن شائع کر رہا ہے، اور اسکی
عنقریب شائع ہونے والی پہلی جلد شیخ کی مثنوی مخزن اسرار کے علاوہ ان کے دیوان پر مشتمل ہوگی، جس کے اشعا
کی مجموعی تعداد ۲ ہزار ہوگی، حالانکہ موجودہ مخطوطات مین اشعار کی مجموعی تعداد بارہ تیرہ سو سے زائد نہین ہے،

۲- نسخۂ نولکشور

یہ نسخہ مطبع نولکشور کے کتب خانہ مین موجود ہے، دیوان کے آخر مین یہ عبارت درج ہے،

"دیوان حضرت اولیائی نظامی گنجوی قدس اللہ سرہ، در دار الخلافت شاہجہان آباد بہ اشتیاق
تمام بسرعت بتاریخ دوازدہم ماہ اگست ۱۸۳۵ء روز دوشنبہ بخط پنڈت دھرم نراین اختتام پذیرفت"

اس نسخہ کی نقل ہم کو ملگئی ہے، اور اس طرح کل چار قلمی نسخون سے مقابلہ وتصحیح کے ساتھ دیوان نظامی
کا ایک صحیح متن ہم نے ترتیب دینا شروع کر دیا ہے، جو امید ہے کہ انشاء اللہ عنقریب تیار ہو کر مطبع مین جائیگا،

مثنوی مولنا روم کا ایک عارفانہ انتخاب

مولانا عبدالماجد دریابادی اڈیٹر سچ فرماتے ہیں،

"مثنوی معنوی کو اللہ نے عجیب وغریب مقبولیت دے رکھی ہے، اور اس سلسلہ میں تازہ ترین اور نہ صرف تازہ ترین بلکہ بہترین انتخاب
وہ ہے جو مغز نغز کے نام سے مولنا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے قلم سے نکلکر ابھی شائع ہوا ہے،
کتاب فاضل مرتب کے ذوق سلیم وحسن انتخاب وسلیقۂ ادب کا روشن ترین آئینہ ہے، صاحب مثنوی علیہ الرحمہ کے اس پھیلاؤ کو اسطرح سمیٹنا کہ
لطف بیان کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے آسان بات نہ تھی، دریا کو کوزہ میں بند کرنا حقیقۃً ایسے ہی موقع کیلئے لکھا گیا ہے، ہر جزو مثنوی کا خلاصہ
پوری لطافت کیساتھ آگیا ہے، کوئی ضروری بات بھی چھوٹنے نہ پائی ہے اور تسلسل ربط بیان اس طرح قائم کہ پڑھنے والے کو کہیں سے پتہ نہیں
چلنے پاتا کہ اس کے سامنے اصل تصنیف نہیں ہے،

کتاب علاوہ طلبا کے عام شائقین کیلئے بھی ہر اعتبار سے مفید اور دلچسپ ہے، چھ ابواب میں تقسیم ہے، کاغذ کتابت طباعت تقطیع سب ظاہری محاسن
کے اعتبار سے پسندیدہ ہے، اور سفر وحضر میں ہر جگہ رکھنے کے قابل ہے، قیمت عہ کچھ بھی نہیں ہے، (پتہ، دائرہ مطبوعات ملیہ، دفتر ضیاء جونپور)

تلخیص وتبصرہ

کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟

رومن حروف جنھیں یورپ کی اکثر زبانیں لکھی جاتی ہیں، اُن کی اصلیت کے متعلق اتنا تو معلوم ہے کہ ان
فنیشین قومیں مشرق سے مغرب کو لائیں، لیکن یہ مسئلہ اب تک پوری طرح ثابت نہیں، کہ وہ کس مشرقی خط کی
ہیں، دسمبر ۱۹۳۲ء میں ایک فرنچ اہل قلم نے فرانس کی مجلس علمی میں اپنی ایک نئی تحقیق پیش کی ہے، جس میں یہ ثابت ک
چاہا ہے، کہ رومن حروف مصر کے مقدس حروف سے ماخوذ ہیں، جنکو ہیروگلیفی کہا جاتا ہے، اس ہیروگلیفی کے لفظ
معنی بھی مقدس حروف کے ہیں،

صاحب قلم مذکور کا ذہن اس نظریہ کی طرف بالکل اتفاقی طور سے متوجہ ہوا، پرانی چیزوں کی ایک دکا
اس کا گذر ہوا، تو وہاں اس کو ایک ایسی کتاب ملی جس میں ہر قوم کے، ہر زمانہ کے، خطوط کے نمونے دیئے گئے
اس کتاب میں اس نے فنیشین حروف کا باب کھولا، تو اس میں اس کو ۲۲ حروف ملے، لیکن بعض حروف
شکلوں کے سمجھنے میں اس کو بڑی دشواری پیش آئی، تو اس نے فنیشیہ کی دوسری ہمسایہ قوموں کے حروف
ان کا مقابلہ کیا، تو ان فنیشین حروف اور قدیم مصریوں کے حروف میں جنکو ہیروگلیفی کہا جاتا ہے، عجیب
مشابہت معلوم ہوئی، تو اس نے مصری حروف میں سے ایک ایسے حرف کی تلاش کی جو فنیشین خط کے پ
"الف" کے مقابل ہو، شکل وصورت، اور آواز وتلفظ دونوں لحاظ سے، تو اسکو ایک حرف ایسا ملا جو مصری
میں "مرد" کی طرف اشارہ کرتا ہے، اب اس نے فنیشین خط کے دوسرے حرف "ب" کا مقابل تلاش

تو اس کو وہ مصری حرف ملا، جو "عورت" سے عبارت ہے، اب یہ مسئلہ حل ہوا، کہ ان حروف کا سرا "مرد" ہے جو
دنیا کے ہر کاروبار کی جڑ ہے، اور اس کے پہلو میں "عورت" ہے جو انسانیت کے تمام مشکلات میں اسکے
ساتھ ہوتی ہے، اتنی بات معلوم ہونے پر یہ خیال سامنے آیا، کہ ان حروف کی ترتیب زبردستی کی نہیں ہے، بلکہ
ایک منظم وباترتیب خیال پر مبنی ہے، ان دو حرفوں کی دریافت نے تحقیق کے اس طالب کو تیسرے فنیشین حرف کی
طرف پہنچایا، اور وہ "جیم" ہے، جو ہیروگلیفی میں ہل کا اشارہ ہے، چوتھا حرف جو "دال" ہے، وہ وہ چلتی پھرتی پنڈلیوں
کو بتاتا ہے، اور پانچواں جو "د" ہے، وہ گھڑیال کی تصویر پیش کرتا ہے، جو بطریق تشبیہ خود مصر کی طرف اشارہ ہے، اب اس
محقق نے ان پانچوں حرفوں کو جب ایک دوسرے کے پہلو میں رکھا، تو اس کو اور مصری آثار قدیمہ کے ہر عالم کو معلوم
ہوا کہ ان پانچ حرفوں میں ایک پورا فقرہ پوشیدہ ہے جو حسب ذیل ہے،

"مرد اور عورتیں جوے کی قید سے مصر سے نکلے ہیں"،

اس سے معلوم ہوا، کہ یہ حروف کسی مرتب خیال پر اور ان کی ترتیب کسی حکیمانہ منطق پر مبنی ہے، اور یہ اس
قصہ کے رموز ہیں، جو بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کو ظاہر کرتا ہے،

باقی فنیشین حروف کے ہیروگلیفی ماخذوں کی حسب ذیل تشریح بھی ملی ہے،

واؤ	"Y"	سورج جس کے نیچے لکڑی کا ایک عمود ہے، جس سے مراد "پورب" کیطرف
ز	"Z"	وہ عضو جو پھیپھڑے کی تمام شاخوں کو ملاتا ہے، جس سے مراد "اکٹھا ہوئے"
ح	"H"	عبادتگاہ، اس سے مراد "عبادتگاہ" ہے،
ط	"T"	مختلف راستوں کا ملنا، یعنی "شہر میں"
ی	"J"	روتی ہوئی آنکھ جس سے مراد "رونے لگے"
ک	"K"	بط جو اپنے دونوں بازو پھیلائے ہے، جس سے مراد "وہ اٹھے"

ل	L	ایک شیر جو حملہ کے لیے تیار ہے، جس سے مراد "بہادر بن کر"
م	m	پہاڑیوں کا سلسلہ جس سے مراد "قوم"
ن	n	ایک شخص دوڑتا ہوا، یعنی "چلا"
س	s	تین ٹیڑھی لکیریں، اس سے مراد "دریا کو عبور کیا"۔
ع	o	ایک دائرہ جس کا کچھ حصہ سایہ میں ہے، اس سے مراد "پورے چاند کے وقت"
پ	P	کمان جس سے مراد "لشکر"
ص		شکار کے آلات جس سے مراد "وہ جو اس کے پیچھے تھا"۔
ق	q	ایک برتن جس سے پانی بہ رہا ہو، جس سے مراد "ڈوب گئے"
ر	R	کھلا ہوا منہ، جس سے مراد "سبھوں نے گایا"۔
ش	s	ایک ہندسی کمان جس سے مراد "جلال اور بزرگی"
ت	T	تاروں بھرا آسمان جس سے مراد "خدا"

اس نظریہ سے یہ منکشف ہوتا ہے، کہ یہ فینیقین حروف مصری قدیم حروف میں بنی اسرائیل کے مصری قصے کی پوری زبانی روداد ہیں،

"س"

اسلامی فن تعمیر

"اسلامی فن تعمیر" پر رسالہ الہلال مصر میں اختصار کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے، اس کی تلخیص حسب ذیل ہے:

اثنائے فتوحات میں جن سلطنتوں کو عربوں نے اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا، ان کے اختلاط اور میل جول سے ایک نیا اسلامی فن تعمیر پیدا ہوا، جس میں اگرچہ کلی طور پر یکرنگی پائی جاتی ہے، لیکن مختلف شہروں کے اثر سے اس کے جزئیات میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کے لحاظ سے اس کی پانچ قسمیں قرار دیجا سکتی ہیں،

مصری اور شامی طرز تعمیر سلطنت امویہ کے زمانے سے شام میں فن تعمیر کے نہایت نادر نمونے قائم ہوئے، جنمیں

دو چیزیں اس عہد کی بہترین یادگاریں ہیں، ایک تو قبہ صخرہ جس کو بیت المقدس میں عبدالملک بن مروان نے بنایا تھا، اور دوسری جامع اموی جسکو ولید بن عبدالملک نے تعمیر کیا تھا، ان دونوں کے اندر کی دیواروں میں پچہ کاری کا کام بنا ہوا ہے، جو بیزنطی صناعوں کی دستکاری کا بہترین نمونہ ہے،

مصر میں اسلامی فن تعمیر کی ابتدا، احمد بن طولون کے زمانے سے ہوئی، اور جب سے اس نے جامع طولونیہ کو اینٹ سے بناکر چونہ سے پختہ کرایا، اور اس پر نہایت نادر نقش و نگار بنوائے، مصریوں نے چونہ کی گچ بنانے میں نہایت کمال پیدا کر لیا،

فاطمیین کے عہد سے مصر میں ایک جدید تمدن کا آغاز ہوا، اور انھوں نے اپنی یادگار بہت سی مسجدیں چھوڑیں، جو حسن و جمال میں فن تعمیر کی بہترین مثال ہیں، اور ان میں سب سے قدیم اور قابل ذکر جامع ازہر ہے، لیکن جامع سلطان حسن جو قلعہ کے پاس ہے، وہ مصر کے آثار اسلامیہ کا سرتاج ہے،

مغربی طرز تعمیر یہ قسم اندلس اور بلاد مغرب یعنی تونس، جزائر اور مراکش کی اسلامی عمارتوں پر شامل ہے، اس وقت تک بلاد مغرب اور اندلس میں جو اسلامی عمارتیں باقی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ مشہور جامع قیروان اور تونس کی جامع زیتون ہیں اور یہ دونوں مصری اور شامی طرز تعمیر سے متاثر ہیں،

مغرب میں مسلمانوں کے طرز تعمیر کی قابل فخر یادگار غرناطہ کا قصر حمرا ہے، جس کی شہرت صرف حسن تعمیر ہی کی بنیاد پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس میں اسکے باغات اور ان فواروں کو بھی بہت بڑا دخل ہے جو درندہ جانوروں کی شکل پر بنے ہوئے ہیں،

ایرانی طرز تعمیر ایران خلفاے راشدین کے زمانے میں مفتوح ہوا، لیکن خلفائے راشدین بلکہ خلفاے بنو امیہ اور بنو عباس کی بھی کوئی تعمیری یادگار ایران میں موجود نہیں ہے، البتہ دسویں اور اگیارہویں صدی ہجری یعنی صفویہ کے زمانے میں دار السلطنت اصفہان میں جامع اصفہان تعمیر ہوئی،

اسلامی عہد میں ایران کی اکثر عمارتوں کی دیواریں کاشانی لوحوں سے مزین تھیں، جس میں ایرانیوں نے نہایت کمال پیدا کیا تھا، اور اس میں نہایت چمکدار رنگ شامل کئے تھے،

ایرانیوں کو نہایت قدیم زمانے سے قالین بافی میں بھی کمال حاصل تھا، اور اب تک یہ کمال باقی ہے، اسلامی فنون لطیفہ میں ایران جیسے مرقع تصاویر بھی نہیں پائے جاتے جس میں آدمیوں اور پرندوں کی تصویروں کے ذریعہ سے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں،

ترکی طرز تعمیر ترکی طرز تعمیر ایرانی اور بیزنطی طرز تعمیر کا مجموعہ ہے، یعنی ترکوں نے ایرانیوں سے الواح کاشانی کے ذریعہ سے دیواروں کے مزین کرنے کا طریقہ سیکھا ہے، اور بیزنطی شکل کی عمارتیں تعمیر کی ہیں،

تمام عثمانی مسجدیں کنیسہ ایاصوفیہ کی طرح، ایک وسیع مربع شکل کی ہیں، جن کے اوپر ایک بڑا قبہ بنا ہوا ہے جو چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے قبوں سے گھرا ہوا ہے،

عثمانیوں نے اول اول مسجدوں کے تعمیر کی یہی شکل اختیار کی تھی لیکن بعد کو ان قبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جو بیچ کے قبہ کو محیط تھے اور ستونوں میں بھی قبے بنائے جانے لگے، پھر ان تمام قبوں کے گرد بھی بہت سے قبے بنائے گئے،

عثمانیوں نے قسطنطنیہ میں جو مسجدیں بنائی ہیں، ان میں جامع بایزید اور جامع سلیمانیہ نہایت ممتاز ہیں،

ہندوستانی طرز تعمیر یہ طرز تعمیر شمالی ہند میں پیدا ہوا اور وہ دو عظیم الشان زمانوں پر مشتمل ہے،

(۱) ایک تو مغلوں سے پہلے کا زمانہ جس میں اسلامی فن تعمیر قدیم ہندوستانی فن تعمیر سے متاثر تھا،

(۲) دوسرے مغلوں کا زمانہ جس میں ایک خاص طرز تعمیر ایجاد ہوا،

ہندوستان کے شہروں میں اسلامی عمارتیں سب سے زیادہ فتح پور سیکری، آگرہ اور دلی میں پائی جاتی ہیں، بالخصوص آگرہ میں جہاں اعتماد الدولہ کا مقبرہ اور تاج محل موجود ہیں،

"ع"

کوہ نور

جنرل آف انڈین ہسٹری میں کچھ عرصہ سے شاہجہان کے عہد کی تاریخ باقساط شائع ہو رہی ہے، اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار

جناب عبدالعزیز بیرسٹر نے کوہ نور کی تاریخ پر ایک محققانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے، عہد مغلیہ کے مورخین کے سامنے یہ مسئلہ ابتدا سے زیر بحث رہا ہے کہ جو ہیرا آج "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہے، اسکی گذشتہ تاریخ کیا ہے، اس باب میں تین مختلف جماعتیں قائم ہو گئی ہیں اور ہر جماعت کے نزدیک "کوہ نور" اس ہیرے سے مختلف ہے جو دوسری جماعت میں اس نام سے موسوم ہے، یعنی اس بحث میں تین مختلف ہیرے پیش کئے جاتے ہیں اور ہر گروہ اپنے ہیرے کو "کوہ نور" ثابت کرنا چاہتا ہے، مقالہ نگار موصوف نے ہر فریق کے بیانات و دلائل پیش نظر رکھنے کے بعد فیصلہ کی کوشش کی ہے، لیکن جیسا کہ موصوف نے اعتراف کیا ہے، اس مسئلہ پر کوئی آخری فیصلہ نہیں دیا جا سکتا، بہرحال موضوع کی دلچسپی کے خیال سے ہم اس مضمون کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

"جن تین ہیروں پر کوہ نور کا گمان ہوتا ہے ان میں پہلا وہ ہے جسے بابر کا ہیرا کہتے ہیں، بابر نامہ کے حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہیرا بابر کے پاس کیونکر آیا:-

"سلطان ابراہیم کی شکست میں گوالیار کا راجہ بکرماجیت مارا گیا، اسوقت بکرماجیت کا خاندان آگرہ میں تھا، ابراہیم کی شکست کے بعد ان لوگوں نے آگرہ سے بھاگنا چاہا لیکن ہمایوں نے وہاں پہنچکر ان کا راستہ روک دیا، اسیران لوگوں نے ہمایوں کے سامنے بہت سے جواہرات اور قیمتی چیزیں پیش کیں، ان میں وہ مشہور ہیرا بھی تھا جو علاء الدین دکن سے لایا تھا، اسکی قیمت کا اندازہ یہ ہے کہ ڈھائی روز تک اس سے تمام دنیا کی خوراک کا انتظام ہو سکتا ہے، بظاہر اس کا وزن آٹھ مثقال ہے، جب میں آگرہ پہنچا تو ہمایوں نے یہ ہیرا میرے سامنے پیش کیا لیکن میں نے اسے واپس کر دیا"

اس ہیرے کی ابتدائی تاریخ قصوں اور غیر مستند روایتوں میں پوشیدہ ہے، پروفیسر ماسکیلائن کا خیال ہے اس پر تاریخ کی روشنی اول اول چودھویں صدی کی ابتدا میں پڑتی ہے، ۱۳۰۰ء میں یہ مالوہ کے راجہ کے قبضہ میں تھا، ۱۳۰۴ء میں سلطان علاء الدین محمد شاہ کی فوج نے مالوہ کو فتح کیا اور اجین کا خزانہ اس قدیم راج کے ہاتھوں سے نکل گیا، اس وقت یہ عظیم الشان ہیرا تاریخی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا، تاریخ میں یہ ذکر نہیں کہ علاء الدین خلجی کے ہاتھ سے نکل کر یہ کیونکر راجگان گوالیار کے پاس پہنچا، بہرحال یہ ایک عرصہ تک ہمایوں کے پاس رہا، پھر جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران پہنچا تو اس نے اس شاہانہ مہمان نوازی کے صلہ میں جو شاہ طہماسپ نے اس کیساتھ برتی تھی یہ ہیرا اور اس کے ساتھ ڈھائی سو لعل بدخشانی

اسکی نذر کیے، خود شاہ جو دربار ایران میں ابراہیم قطب شاہ والیٔ گولکنڈا کا سفیر تھا بیان کرتا ہو کہ شاہ طہماسپ نے اس ہیرے کی تو
نہ کی اور کچھ دنوں کے بعد اسے نظام شاہ فرمانروائے دکن کے پاس بطور ہدیہ بھیجدیا، اس روایت کی تصدیق تاریخ فرشتہ
سے بھی ہوتی ہے، اس کا وزن بابر کی روایت کے مطابق آٹھ مثقال تھا یعنی (۳۲۰) رتی یا (۵۸۹، ۴۴) چاول،

دوسرا ہیرا جسے بعض لوگ "کوہ نور" بتاتے ہیں وہ ہے جو میر جملہ کے ہیرے کے نام سے مشہور ہے، اس کے متعلق شاہجہاں
کے دربار کا مستند مورخ محمد وارث بادشاہ نامہ کی تیسری جلد میں بیان کرتا ہے کہ "۱۸ صفر ۱۰۶۶ھ ہجری (۱۷ دسمبر ۱۶۵۵ء)
کو نئے وزیر اعظم محمد سعید میر جملہ نے شاہجہاں کے سامنے پیشکش کے طور پر قیمتی جواہرات حاضر کیے جنمیں ایک بڑا ہیرا بھی تھا
جس کا وزن (۹) ٹانک یا (۲۱۶) سرخ تھا، اور جس کی قیمت دو لاکھ سولہ ہزار روپیہ تھی"، اس بیان کی تصدیق نہ صرف
قا نو نچہ (۹) اور مآثر الامرا بلکہ عمل صالح اور منتخب اللباب سے بھی ہوتی ہے، تمام مقامات پر اس کا وزن ٹانک کے علاوہ
رتی میں بھی دیا ہوا ہے اور اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اسکا وزن (۲۱۶) جوہری رتی یا (۵۰۴، ۵۶) چاول تھا،

تیسرا ہیرا وہ ہے جو اب عام طور پر "کوہ نور" کے نام سے مشہور ہے، ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اسے دہلی سے لے گیا، بیان
کیا جاتا ہو کہ اُسی نے اسکا نام "کوہ نور" رکھا تھا، ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد کوہ نور اُس کے جانشین شاہ رخ کے قبضہ
میں آیا، شاہ رخ نے اسے احمد شاہ درانی کو دیدیا اور احمد شاہ کے بعد یہ اس کے لڑکے تیمور کو وراثت میں ملا، تیمور کے بعد ۱۷۹۳ء
میں یہ اُس کے بڑے لڑکے شاہ زماں کے ہاتھ آیا، دو سال کے بعد یہ شاہ زماں کے تیسرے بھائی شاہ شجاع کے قبضہ میں آیا،
شاہ شجاع اپنے بڑے بھائی محمد سے شکست کھا کر رنجیت سنگھ کے دربار میں لاہور پہنچا اور کابل کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے
مدد کا خواستگار ہوا اور اس کے معاوضہ میں کوہ نور رنجیت سنگھ کی نذر کردیا، یہ ۱۸۱۳ء کا واقعہ ہے، ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ
کے مرنے کے بعد کوہ نور اس کے جانشین دلیپ سنگھ کے قبضہ میں آیا، ۱۸۴۹ء میں پنجاب سلطنت برطانیہ میں شامل کرلیا گیا،
اور جدید بورڈ آف گورنمنٹ نے "کوہ نور" کو حاصل کرکے ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجدیا،

یہ ہے ان ہیروں کی تاریخ، ان کے متعلق تین مختلف رائیں ہیں، بعض مورخین مثلاً پروفیسر باسکیلائن کا خیال
ہے کہ بابر کا ہیرا اور کوہ نور در اصل ایک ہی چیز ہیں، دوسرے گروہ کی جسمیں ڈاکٹر بال سب سے زیادہ ممتاز ہیں یہ رائے ہو کہ

میر جملہ کا ہیرا اور کوہ نور ایک ہیں، تیسری جماعت اس طرف گئی ہے کہ تینوں ایک ہی ہیں،

اس مسئلہ میں سب سے زیادہ غلط فہمی فرانسیسی سیاح ٹیورنیر کے بیان سے پیدا ہوئی ہو جو ایک عرصہ تک شاہجہاں کے
دربار میں تھا اور جس نے خود وہ ہیرا دیکھا تھا جسے وہ میر جملہ کا ہیرا لکھتا ہو، پروفیسر باسکیلائن کا خیال ہے کہ "کوہ نور" اور بابر کا
کا ہیرا حقیقۃً ایک ہی چیز ہیں اور یہی وہ ہیرا تھا جسے ٹیورنیر نے دیکھا تھا لیکن اس نے غلطی سے اسکو میر جملہ کا ہیرا سمجھا
اور اس کے ساتھ وہ روایت شامل کردی جو میر جملہ کے ہیرے کے متعلق اسوقت تمام طور پر رائج تھی،

بابر نامہ کی عبارت سے بلا شبہہ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ بابر کے ہیرے کا وزن (۳۲۰) معمولی رتی سے کچھ کم و بیش تھا
اور اگر ہم ایک مثقال کو (۲۷) جوہری رتی کے برابر مانیں تو اس ہیرے کا وزن (۲۱۶) جوہری رتی ہوتا ہے، وزن کی
اسی یکسانی کے لحاظ سے مسٹر ہوپ رج کا خیال ہے کہ بابر اور میر جملہ کے ہیرے ایک ہی ہیں، اور میر جملہ نے اس
ہیرے کو جنوبی ہند میں کہیں پایا تھا اور وہاں سے لاکر شاہجہاں کے حضور میں پیش کیا تھا، اس طرح فرض کرنے سے
بابر کے ہیرے کا دوبارہ خزانہ مغلیہ میں آنا بھی ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اس نظریہ کو تسلیم کرنے میں تامل یہ ہے کہ اگر میر جملہ
کا ہیرا بابر کا ہیرا ہوتا تو میر جملہ اسکا فخریہ اعلان کرتا اور درباری مورخین بھی اس واقعہ کا ذکر ضرور کرتے، لیکن ایسا
نہیں ہوا، علاوہ بریں دونوں کی قیمتوں میں بھی بے حد فرق ہے، جس ہیرے کی قیمت شاہجہاں کے دربار میں زیادہ
سے زیادہ تین لاکھ روپئے قرار پائی تھی وہ ہیرا نہیں ہو سکتا جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو تیس سال قبل ایک غیر محدود
رقم سے کیا گیا تھا اور پھر ۱۸۳۸ء میں رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جس کی قیمت تین کرور روپیہ ٹھہری تھی،

تمام شہادتوں کو پیش نظر رکھنے اور ہیروں کے اوزان کا باہم مقابلہ کرنے سے گمان غالب یہی ہوتا ہو کہ
بابر کا ہیرا اور "کوہ نور" ایک ہی چیز ہیں، تاہم یہ واقعہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بابر کے ہیرے کا خزانہ مغلیہ
میں دوبارہ داخل ہونا آج تک ثابت نہیں ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے "کوہ نور" اور بابر کے ہیرے
کو قطعی طور پر ایک نہیں سمجھا جا سکتا،

"ع ز"

اخبار علمیہ

ہندوستان اور افریقہ کا قدیم تعلق

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں سال پیشتر بحرِ عرب میں ایک عظیم الشان براعظم
تھا جو ایک طرف ہندوستان سے ملا ہوا تھا اور دوسری طرف افریقہ سے، اس براعظم کی دریافت و تحقیق کے
جو علمائے ارضیات کے ہاں لیموریا کے نام سے معروف ہے، عنقریب ایک مہم بحرِ ہند کو روانہ ہونے والی
سائنس دانوں کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ کسی زمانہ میں لیموریا، ہندوستان، افریقہ، اور آسٹریلیا کو باہم
تھا، مسٹر لیویس اسپنس جنھوں نے اس مسئلہ کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے بیان کرتے ہیں کہ اس براعظم کو
ہوے زیادہ عرصہ نہیں گذرا کیونکہ اس کے بعض حصے سترہویں صدی کے آخری ربع میں سطحِ آب پر دکھائی
دیتے تھے، جیسا کہ اس وقت کے جہازرانوں کی عینی شہادت سے معلوم ہوتا ہے، ان کی رائے ہے کہ لیموریا
چھوٹے چھوٹے براعظموں یا بڑے بڑے مجمع الجزائر میں منقسم تھا اور اس میں ایک سفید نسل کے لوگ آباد تھے
جنکا تمدن عہدِ حجری کے آخری دور کا تمدن تھا اور وہ فنِ تعمیر میں نمایاں قابلیت رکھتے تھے، مسٹر اسپنس کا
یہ ہے کہ ایک براعظم جزائر سینڈوچ سے نیوزی لینڈ تک پھیلا ہوا تھا، دوسرا نیو کیلیڈونیا اور سماترا سے
اور تیسرا جزیرہ ایسٹر کے قریب واقع تھا، اس جزیرہ پر سنگ تراشی کے عظیم الشان نمونے اب تک موجود ہیں
نے دو سو برس سے زائد سے اہلِ سائنس کو حیرت میں ڈال رکھا ہے، لیکن اس نظریہ پر تمام سائنس دانوں کا
نہیں ہے اور اس باب میں دو مختلف جماعتیں ہیں، ایک کا خیال ہے کہ بحرالکاہل اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے

جماعت کہتی ہے، کہ اس میں متعدد تغیرات پیش آچکے ہیں، علمائے ارضیات کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ جب دنیا
اپنی حیات کے ابتدائی دور میں تھی اس وقت ایک قدیم اور زبردست براعظم مسمی بہ گونڈوانا لینڈ جس میں افریقہ،
ہندوستان کا ایک حصہ، امریکہ، اور آسٹریلیا شامل تھے، کرۂ ارض کے جنوبی نصف کو گھیرے ہوئے تھا، اس براعظم
اور کرۂ ارض کے شمالی نصف کے درمیان ایک عظیم الشان بحرِ اعظم حائل تھا جسے ٹیتھامیس (TETHYS) کہتے تھے
اور بحرِ روم جسکا ایک باقی ماندہ حصہ ہے، اس گروہ کی رائے ہے کہ یہ براعظم اب سے چوبیس کروڑ برس پیشتر موجود تھا،
اور اس وقت کوہِ ہمالیہ اور اس سے ملحق تبت کے خطے تہِ آب تھے، اس کے بعد ہزارہا ہزار سال کی مدت میں بعض دوسرے
ارضی تغیرات کے باعث لیموریا کا وجود عمل میں آیا اور براعظم ایشیا اپنی موجودہ شکل میں ظاہر ہونے لگا، پھر کچھ زمانہ کے
بعد ہندوستان، افریقہ، اور آسٹریلیا سب علٰحدہ علٰحدہ ہوگئے،

طوالتِ عمر کی نادر مثالیں

حال میں چین سے خبر آئی ہے کہ لی چنگ یُون نے جو تمام دنیا کا سب سے زیادہ طویل العمر انسان تھا، (۲۵۶)
سال کی عمر میں انتقال کیا، یہ شخص جو ایک کاشتکار اور جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا اور اب ایک مدت دراز سے اپنا وقت
غور و خوض اور عبادت میں صرف کر رہا تھا خود اپنی روایت کے مطابق ۱۶۷۷ء میں پیدا ہوا تھا، اس کے اہلِ وطن
بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، تین سال ہوے ایک خاص وفد محض اس کو دیکھنے کی غرض سے چین گیا تھا
اس وفد کا بیان ہے کہ وہ ایک تندرست اور زندہ دل شخص تھا، جس کی عمر بظاہر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان معلوم
ہوتی تھی، اُس نے اپنی غیر معمولی طویل عمر کی وجہ یہ بیان کی کہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جب کہ وہ جڑی بوٹیوں کی
تلاش میں پہاڑوں پر گھومتا پھرتا تھا، اتفاق سے ایک روز اُسے ایک نادر جڑی ہاتھ آگئی جسے اس نے کھالیا،
اسی کے اثر سے اس کی عمر اتنی بڑھ گئی،

ناگپور میں ایک شخص سیدی استاد نامی ابھی موجود ہے جس کی عمر صوبہ جات متوسطہ کے افسرِ مردم شماری

کی رائے میں (۱۳۰) سال ہے، اگرچہ تو دناگپور کے لوگ اسکو (۱۵۰) سال کا بتاتے ہیں، ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی وبا تک اس کی صحت نہایت عمدہ تھی، لیکن اس کے بعد سے اس کے دانت ٹوٹ گئے ہیں اور بال سفید ہو گئے ہیں، سیدی استانی جس کا باپ افغان اور ماں عرب تھی ایک زمانہ میں گائکواڑ بڑودہ کے دربار کا مشہور پہلوان تھا اور ۱۸۵۷ء میں اپنے فن کے شباب میں تھا، اس کا بیان ہے کہ میسور کی لڑائی اور سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو کی وفات (۱۷۹۹ء) اُسے یاد ہے، سیدی ہی کی عمر کے قریب امریکہ کے مشہور جان شل (UNCLE JOHNNY SHELL) کی عمر بھی تھی جو چند سال قبل (۱۳۲) برس زندہ رہکر مرا ہے، ۱۹۱۸ء میں لوگ اُسے دیہات سے شہر میں لائے جہاں وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز اور ریل میں سوار ہوا، متعدد ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا اور اس نے چند کاغذات پیش کئے جن سے معلوم ہوا کہ اس کی پیدائش ۱۷۸۶ء کی ہے۔

اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ بوڑھا آدمی غالباً زارو آغا ہے، اس مشہور ترک کی پیدائش ۱۷۷۴ء کی ہے، چند سال ہوئے اس کے ایک لڑکے کا انتقال (۱۱۰) سال کی عمر میں قسطنطنیہ میں ہوا ہے، زارو آغا گوشت بہت کم کھاتا ہے، اس کی غذا زیادہ تر پھل، ترکاری، اور دودھ ہے،

انگلستان میں بھی دو آدمی ایسے گذرے ہیں جن کی عمروں تک وہاں کا کوئی دوسرا شخص نہیں پہنچا، ایک ہنری جنکنس جس کی وفات (۱۶۹) سال کی عمر میں ۱۶۷۰ء میں ہوئی، اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جنگ فلاڈن (۱۵۱۳ء) میں موجود تھا، اور اس وقت اس کی عمر (۱۲) سال تھی، دوسرا مشہور شخص بوڑھا "پار" ہے جس کا انتقال ۱۶۳۵ء میں ہوا جبکہ اس کی عمر (۱۵۲) سال تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ سو برس کے سن میں اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے (۱۱۳) سال کی عمر پائی،

اسپین اور پوپ کی جنگ

اسپین کے جس قومی انقلاب نے ملوکیت کا خاتمہ کر کے ایک جمہوری حکومت قائم کردی ہے اُسی نے حال میں عیسائیت کے بعض اہم حقوق پر بھی حملے کئے ہیں اور اسپین میں جو اٹلی کے بعد کیتھولک مذہب کی سب سے بڑی

طاقت خیال کیا جاتا تھا اس مذہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے، ۲ر جون ۱۹۳۳ء کو پریزیڈنٹ زامورا (صدر جمہوریہ ہسپانیہ) نے اس بل پر دستخط کر دیئے جس سے اسپین کے جدید مذہبی قوانین کا نفاذ ہوتا ہے، ان قوانین کے رو سے کلیساے اسپین کی تمام جائداد قومی حکومت کی ملک قرار دیگئی ہے، اور پادریوں کو صنعت و حرفت میں حصہ لینے اور مدرسوں میں تعلیم دینے سے قطعاً روک دیا گیا ہے، جس روز پریزیڈنٹ زامورا نے یہ قوانین نافذ کئے اس کے دوسرے ہی روز پوپ نے حکومت اسپین کے نام نہایت برہمی کا ایک خط روانہ کیا جس میں مذہب اور کلیسا پر اس سخت حملے کے خلاف احتجاج کیا ہے، اسپین کے بعض کیتھولک حلقوں میں بھی ان قوانین کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے لیکن چونکہ ان کا نفاذ جمہوریۂ اسپین کی مجلس عامہ کی جانب سے ہوا ہے اس لئے یہ تمام مخالفتیں غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہیں، تخمینہ ہے کہ ار جنوری ۱۹۳۴ء سے (۶۹۹۸۳۷) طلبہ پادریوں کی تعلیم سے آزاد ہو جائیں گے،

مدرسۂ علوم عربیہ غرناطہ

مدرسۂ علوم عربیہ، غرناطہ سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ جو لوگ اسپین جاکر وہاں کے مناظر و تمدن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی سہولت کے لئے تعطیل کے زمانہ میں مدرسۂ مذکور نے خطبات کے ایک سلسلہ کا انتظام کیا ہے، جو امسال ۱۰ر ستمبر سے ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۳ء تک حسب ذیل مضامین پر انگریزی فرانسیسی زبانوں میں دیئے جائیں گے،

(۱) اسپینی لٹریچر۔ (۲) تاریخ اسپین، (۳) اسپینی آرٹ

(۴) اسپین کا جغرافیہ، (۵) موجودہ اسپین، (۶) اسپین کے تمدن پر عربوں کا اثر،

(۷) اسپین کے آرٹ پر عربوں کا اثر، (۸) اسپینی زبان کا نصاب

"ع ز"

ادبیات

سوز و ساز

(بوجہ انور حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام)

از حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی

مل گیا صوتِ سرمدی — میرے شکستہ ساز سے،
نغمہ کی آتی ہے صدا — نوحۂ دل گداز سے
اب تو مری نظر میں ہے — حُسن ہی حُسن ہر طرف
خلعتِ عشق مل گیا — بارگہِ مجاز سے
حاصلِ عمر مل گیا — قلبِ فسُردہ کھل گیا
پڑگئی زندگی میں جان — اُن کی نگاہِ ناز سے
برسوں کے بچھڑے مل گئے — داغ دلوں کے دُھل گئے
لپٹی ہے اُن کی خاکِ پا — میرے سرِ نیاز سے
حلِ کانک تراہ — آج صحیح ہو گیا
رفع یدین کر سکے — کون اب اس نماز سے
دل کی شکستگی نے آج — جوڑ دیا کسی کے ساتھ
دیکھ لیا رخِ حسیں — اس درِ نیم باز سے
حالتِ وجد و ذوق میں — دل سے، یہ کہہ رہا ہی درد

"ہم نے ملا دیا تجھے — لے، ترے چارہ ساز سے"
ہر رگِ جانِ امجد اب — رقص میں ہے بصد طرب
بربطِ روح بھر گیا — نغمۂ دل نواز سے

وثائقِ حقائق

از جناب میرزا عزیز صاحب فیضانی، دارا پوری

(۱)
عشق سرور میں ماسوا سے کیا کام — سید ھا رستہ ہے رہنما سے کیا کام
اس رہ میں فقیر بنکے جاتا ہوں عزیز — جو بھی مل جائے، مدعا سے کیا کام

(۲)
کیوں آج ہے کل کی فکر، کیسا ہو گا — ایسا سوچیں ہی کیوں کہ ایسا ہو گا
ہاں چھوڑ کے کل کو، کچھ کرو آج کی فکر — کل ہی دیکھینگے کل کو، جیسا ہو گا

(۳)
میدانِ عمل نہ ہو تو جینا بیکار — دنیا بے سود، روزِ عقبےٰ بیکار
اب وقت ہے کوئی کام کر لے غافل — یادِ ماضی و فکرِ فردا بیکار

(۴)
چھوڑو غفلت کو، آنکھ کھولو، جاگو — یہ وقت کی ہے صدا کہ جاگو جاگو
تم سوتے ہو اور جاگ اٹھی ہے دنیا — جاگو! جاگو!! اخدا کے بندو جاگو!!!

(۵)
پھر جلوہ فگن جہاں میں خاور ہو گا — دنیا میں بلند نام سرور ہو گا
"مغرب" میں غروب ہو چکا ہے، اب پھر — "مشرق" سے طلوعِ مہرِ انور ہو گا

(۶)
نظارہ و رونقِ جوانی دلکش — ہستی دلکش ہے، زندگانی دلکش
دلکش ہے عزیز "نقشِ اول" لیکن — ہو گا کس درجہ "نقشِ ثانی" دلکش

مطبوعات جدیدہ

مولنا شبلی اینڈ عمر خیام ۔ (انگریزی) تالیف جناب رستم پستن جی بھاجی والا، ۱۱۸ صفحے، قیمت مع خوبصورت جلد للعہ مصنف سے امباواڑی مزے گاں، بمبئی نمبر ۱ کے پتہ سے طلب کریں،

جناب رستم پستن جی بھاجی والا بمبئی کے ایک معزز پارسی خاندان کے رکن ہیں، ان کو حب وطن کے طور
ادبیات سے عموماً اور خیام سے خصوصاً گہری شیفتگی ہے، اور اسی تعلق سے فارسی ادبیات کے خدمتگذار شبلی نعمانی کی
ان کے دل میں جاگزیں ہوئی، زیر نظر کتاب انہی اثرات کا آئینہ ہے، اس میں پہلے تقریباً پچاس صفحوں میں
شبلی کے سوانح حیات شرح و بسط سے لکھے ہیں، بلکہ مولنا کے حالات میں اب تک اس سے مفصل کوئی چیز
نہیں گئی، مصنف نے کاوش سے ان تمام ماخذوں پر نظر ڈال لی ہے، جو سیرت شبلی سے متعلق ہو سکتے ہیں، نیز مستند
سے دیگر حالات بھی فراہم کئے ہیں، پھر شعر العجم کے حصہ "خیام" کا ترجمہ ہے، جس میں کہیں کہیں مترجم نے خود حاشیے بھی
خیام کے حالات میں بعض باتیں اسوقت تک علمی حلقوں میں بعض حیثیات سے "خلافیات" کی شکل رکھتی
اور شعر العجم کے اس حصہ پر بھی اختلافی مضامین نکل چکے ہیں، جنکا حوالہ بھی زیر نظر کتاب کے تبصرہ میں، اردو کے ایک
میں نظر سے گذرا، جس میں مترجم موصوف کو مطعون کیا گیا ہے، کہ اُس "تحقیقی نقد نظر" کو مترجم نے نظر انداز کر دیا ہے
مضامین میں پیش کئے گئے ہیں، لیکن کیا ستم ہے کہ معترض نے بھی اُس جواب نقد کو نظر انداز کر دیا ہے، جو ان خلافیات
میں بہر صورت نظر انداز کرنے کے لائق نہیں، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اسوقت تک عمر خیام کے موضوع پر بعض
لانیحل رہ گئے ہیں، لیکن ہمیں انھیں یہاں چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ امروز فردا میں حضرت الاستاذ مولانا سید
ندوی کی ایک ضخیم تصنیف "عمر خیام" چار پانسو صفحوں میں پریس سے نکلنے والی ہے، جو امید ہے کہ خیام کے ما

جامع ہونے کے علاوہ ان خلافیات میں بھی شاید قول مختتم بن سکے،

کتاب کے آغاز میں ایک دوسرے فاضل پارسی مستشرق جناب شمس العلماء ڈاکٹر سر جیون جی جمشید جی مودی
پی ایچ ڈی، ال ال ڈی، سی آئی ای کے ٹی، کا ایک مقدمہ ثبت ہے، جس میں مقدمہ نگار نے اپنے انکسار کے باوجود
ادبیات ایران پر فاضلانہ نظر ڈالی ہے، اور فاضل مترجم نے شعر العجم کے حصہ کے ترجمہ میں رباعیات خیام کا انگریزی ترجمہ بھی
اپنے ذوق و شوق سے خود کیا ہے، جو سلیس اور شگفتہ ہے، اور یوں تو پوری کتاب کی زبان نہایت شستہ سلیس اور
عام فہم ہے، ہم جناب بھاجی والا کو اس مفید خدمت پر دلی مبارکباد دیتے ہیں،

کیفیۃ العارفین و نسبۃ العاشقین (فارسی) مرتبہ و مصححہ جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ گیا، حجم مجموعی ۸۰۰ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ، قیمت عہ، پتہ:۔ خانقاہ منعمیہ ابو العلائیہ، محلہ رام ساگر گیا،

حضرت سید شاہ عطا حسین صاحب منعمیؒ (۱۲۳۱ھ ۔ ۱۳۱۱ھ) دور آخر میں صوبہ بہار کے برگزیدہ بزرگوں
میں گذرے ہیں، موصوف اپنے حین حیات میں اپنا فیض عام جاری کئے رہے، اور صوبہ بہار کے جنوبی اضلاع
خصوصیت سے اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوئے، اور موصوف کی وفات کے بعد بھی ان کی تصنیفات لوگوں کی روحانی
تسکین کا ذریعہ ہیں، اور سلسلۂ فیض جاری ہے، موصوف کی تقریباً تیس ۳۰ سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں ہیں، جنمیں سے
بعض ان کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں، لیکن ان کا بیشتر حصہ قلمی صورت میں ان کی خانقاہ کے کتب خانہ میں محفوظ
ہے، مسرت ہے کہ اس خانقاہ کے لائق سجادہ نشین جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب منعمی نے ان قلمی کتابوں
کی اشاعت کا تہیہ کیا ہے، اور اسی سلسلہ کی پہلی کڑی زیر نظر کتاب کیفیۃ العارفین و نسبۃ العاشقین ہے، جو سلسلۂ
ابو العلائیہ کے اکابر مشائخ و خلفا کی مرتب سوانح عمریوں پر مشتمل ہے، اور اس میں حضرت مخدوم ابو العلاء رحمۃ اللہ
(۹۹۰ھ تا ۱۰۶۱ھ) کے عہد سے مصنف کے زمانہ تک کے بزرگوں کے مختصر حالات، روحانی جذب و شوق، رحلت
اور مقام دفن وغیرہ کی مرتب تصریحات ہیں، مصنف کے زمانہ کے مشائخ و خلفا میں زیادہ تر صوبہ بہار کے بزرگوں

کا تذکرہ آیا ہے، کتاب کے مرتب و مصحح جناب سید شاہ حسین الدین احمد صاحب نے کتاب میں جا بجا خود بھی حواشی
لکھے ہیں، جنسے ان اسلاف کے اخلاف کا تذکرہ بھی منضبط ہوگیا ہے، نیز موصوف نے کتاب کے آخر میں ایک اردو
ضمیمہ بھی لگا دیا ہے، جس میں پہلے مصنف کے حالات زندگی، پھر ان کے خلفار و مسترشدین کے حالات و تراجم ہیں
اور اسی ذیل میں خانقاہ دانا پور وگیا کے تاریخی حالات بھی ضمناً آگئے ہیں، اور کتاب کی ابتدا میں مرتب کا ایک دیباچہ
ہے، جسمیں مصنف اور تصنیف دونوں کا سرسری تعارف کرایا گیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اپنے عہد کے بہت
سے ایسے اکابر کے حالات منظر عام پر آگئے، جو ابھی تک نگاہوں سے اوجھل تھے، اور جو ہندوستان کے پچھلے
دور کی تاریخی تحقیقوں میں ماخذ بن سکتے ہیں، اسلئے مرتب موصوف نہ صرف تصوف کے حلقہ سے بلکہ علمی حلقوں کیجانب سے بھی شکریہ کے مستحق ہیں،
ضرورت ہے کہ موصوف مصنف کی دیگر قلمی کتابوں کو بھی وقف عام فرما کر علم و تصوف دونوں کی خدمت انجام دیں،

مثنوی یاد اسلام، از جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب آہ، امیٹھوی، حجم ۷۶ صفحے، تقطیع چھوٹی،
لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۱۰ ار پتہ :- مولوی محمد ساجد صاحب، مغل پورہ فیض آباد،

جناب آہ امیٹھوی، امیر مینائی مرحوم کے وہ تلمیذ رشید ہیں جنکو وہ اپنے نومشق شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح کے لیے منتخب کرتے
اور اردو کے مشہور لغت امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں بھی اپنے استاد کے دست راست تھے، لیکن رامپور سے قطع تعلق کے بعد خلوت نشین ہو گئے
تھے اور اب ایک زمانہ بعید کے بعد اس مثنوی یاد اسلام کے ذریعہ پھر شریک بزم ہوئے ہیں، یہ مثنوی حالی کی مثنوی کے طرز پر لکھی ہے جس سے عروج
و زوال اسلام دونوں کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں اسلام کو محض قرآن مجید ہی کی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا گیا
ہے، ابتدا حمد و صفات الٰہی کا ذکر ہے، پھر صنعت و خلقت سے صانع و خالق کے وجود کا ذکر کرکے خالق باری تعالیٰ کا تصور پیش کیا ہے، اس کے بعد
تخلیق آدم، ضرورت رسالت، نبوت محمدی، سیرت نبوی، فضائل اسلام اور کارنامہ اسلام کا تذکرہ ہے، پھر یہیں سے گریز ہے اور دور حاضر کے
مسلمانوں کا حال زار آتا ہے، اور در اصل یہیں سے یہ مثنوی مسدس حالی سے بھی جدا ہوتی ہے کہ حالی نے اپنے زمانہ کے حالات کے اعتبار سے علما
کیا ہے، آہ نے اپنے دور کے خوب پسند مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے، اور پھر اصلاح حال کی دعوت دی ہے، مثنوی کا طرز بیان مؤثر اور دلنشین ہے،
ضرورت ہے کہ اس کی عام اشاعت ہو کہ اسکا مطالعہ عام و خاص دونوں طبقوں میں دلچسپی سے کیا جاسکتا ہے،

" ر "

دار المصنفین کی ادبی کتابیں

شعر الہند حصہ اول، جسمیں قدما کے دور سے لیکر دور
جدید تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات و انقلابات کی
تفصیل کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام
کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی
اعلیٰ، مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۴۵۰ صفحے قیمت للعہ،
حصہ دوم، جسمیں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی
غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت
سے تنقید کی گئی ہے، کاغذ اور کتابت عمدہ، ضخامت
۴۵۰ صفحے، قیمت للعہ

گل رعنا، اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اسکی شاعری
کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعرار کے صحیح حالات اور
انکے منتخب اشعار، اردو میں شعرار کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے،
جسمیں آب حیات کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی
سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۸۰ ۵ صفحے،
قیمت صہ، از مولٰنا سید عبد الحئی صاحب مرحوم

مکاتیب شبلی، مولٰنا شبلی مرحوم کے دوستوں،
عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جسمیں
مولٰنا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات
ہیں، جو درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ
ہے، طبع دوم، قیمت جلد اول ۱۲ جلد دوم ۱۲
ضخامت حصہ اول ۳۴۹ صفحے دوم ۳۶۱ صفحے،

موازنۂ انیس و دبیر، اردو کے مشہور باکمال شاعر
میر انیس کی شاعری پر ریویو، اردو میں فصاحت و بلاغت
کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ، میر انیس کے بہترین
مرثیوں کا انتخاب، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو
میں اپنے فن میں یہ پہلی کتاب ہے، ضخامت ۲۸۴
صفحے، قیمت سے، ر، للعہ،

کلیات شبلی اردو، مولانا کی تمام اردو نظموں
کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف
مجلسوں میں پڑھے گئے اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی
مذہبی، اور تاریخی نظمیں، جو کانپور، ترکی، طرابلس
بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق
لکھی گئی ہیں، یکجا ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں
کے چہل سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی
چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت: عہ

افادات مہدی، ملک کے نامور انشا پرداز
ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰
مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ و ضمیمہ جات، مطبوعہ
معارف پریس اعظم گڈھ، لکھائی چھپائی عمدہ قیمت
ہے ر حجم ۳۷۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جسمیں ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلچسپ
انداز میں بیان کیگئی ہے، ۲ ر کے ٹکٹ بھیجکر طلب کریں،